
لڑکی اور جنگل
اے حمید
فیض آرٹ
بک ڈپو
انار کلی

لڑکی

اور

جنگل

ناول

اے حمید

۶ جنوری ۱۹۴۵

اے حمید

ناول

لڑکی اور جنگل

ناول

لڑکی اور جنگل

اے حمید

پرنٹر : میاں بشیر احمد

پبلشر : خالد بکڈپو چوک انارکلی لاہور

مطبع : نامی پریس لاہور

قیمت : ۳/۵۰

تعداد ایک ہزار

لڑکی اور جنگل

اے حمید

(ناشر)
خالد بک ڈپو چوک انار کلی لاہور

پرنٹر: میاں بشیر احمد

پبلشر: خالد بکڈپو چوک انارکلی لاہور

مطبع: نامی پریس لاہور

قیمت: ۳۶۵۰

تعداد ایک ہزار

لڑکی اور جنگل

اے حمید

(ناشر)

خالد بک ڈپو چوک انارکلی لاہور

۱

میری اچھی فریدہ!

تمہارا خط پڑھ کر تم سے باتیں کرنے کو دل اسی طرح بے چین ہوا۔ جس طرح صبح دم آفتاب کی پہلی کرن کلیوں کی چٹک سننے کو بے تاب رہتی ہے۔ جیسے ایک جوان بندگی کٹھن رات، گذارنے کے بعد نمود سحر پر خود بخود شبنم کے موتی کا ہار گلے میں ڈال کر مسکرا اٹھتی ہے۔ اور یہ ہے بھی سچ۔ تم ہی کہو ایک طویل مدت کے بعد جب اپنی پیاری اور کبھی زمانے کی راز دار سہیلی کا خط مل جاتا ہے۔ تو دل میں خوشیوں کے شادیانے نہیں بج اٹھتے کیا؟ گذری ہوئی صحبتوں اور بیتے

دنوں کے مدھم نقوش یادوں کے پردوں پر چھائیاں بن کر ابھرنے لگتے ہیں۔ جیسے مسلے ہوئے پھولوں سے بارش کے بعد اچانک دھیمی دھیمی خوشبو اپنے آپ اٹھنے لگتی ہے۔ جیسے کوئی نوحہ اپنے آپ ہی کسی پر مسرت راگ میں تبدیل ہو جائے۔ جیسے آنسو شبنم سے بھری ہوئی پنکھڑی پہ خوشی سے مسکرانے لگے۔ بقول شاعر:-

ع جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

فریدہ!

آگ لاکھ بجھا دی جائے۔ مگر راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں دیر تک سلگتی رہا کرتی ہیں۔ تمہارا پیارا پیارا خط پڑھ کر چند مانوس یادیں ذہن کے افق پر پرانے بادلوں کے سنہری ٹکڑے بن کر ابھر آئیں۔ دل نے رونا چاہا۔ بہت زیادہ رونا چاہا۔ مگر میں نے کمال ضبط سے کام لیا۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ مجبوری کے آنسو محبت کی یادوں کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ اور وہ قبل از وقت مٹ جاتی ہیں۔ نہ جانے زمانہ اور کیا کیا رنگ ،

دکھاتے۔

کتنی بہاروں کو خزاں کرنا پڑے۔ ابھی آنسو نہ بہا میری برباد محبت! ابھی ان پتوں کو اپنی ٹہنیوں سے مت جھاڑ جب خزاں آئے گی تو کیا کرے گی؟ اور فریدہ! میں نے آنسو نہیں بہائے۔

آنسوؤں کو آنکھوں میں ہی پی گئی۔ میری آنکھیں خشک ہیں۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود میرا چہرا اشکبار ہو گیا ہے

مجھے کالج کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ جہاں اب بھی تیری محبوب یادوں کے ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے کسی برہن کے آنسو — جیسے کسی جنگل میں جھیل کے تاریک پانیوں میں ساکت سطح پر کنول کے خوش رنگ پھول تیر رہے ہوں بے لوث محبت کی یادیں — اور حسین ترین خیالات ہماری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ تلخی کے اندھیارے میں امید کی ننھی ننھی قندیلوں کی مانند روشن رہتے ہیں۔ اور اسی طرح کاروانِ حیات سرگرم سفر رہتا ہے حتیٰ کہ وقت کی آغوش میں دم توڑ دیتا ہے۔

فریدہ! تمہارا خط بہار کے سانس کی طرح میری پژمردہ

زندگی میں سے ہو کر نکل گیا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ مصروفیتوں
اور الجھنوں تک میں رعنائی تھی۔ لیکن اب زندگی تھک گئی ہے
پرانے نام زندہ نہیں ہو سکتے۔ طبیعت کی تازگی، اور شگفتگی دم
توڑ چکی ہے بہت دیر ہو گئی۔ زندگی کا رسیلا پن کہیں کھو
گیا ہے۔

ع پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں ــــــ
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے ــــــ

ــــ فریدہ زندگی کے وہ خوبصورت اور بیتے دن وہ لمحے۔ وہ
ساعتیں ــــ وہ دھڑکنیں انہیں کہاں تلاش کریں۔؟

وہ اب دوبارہ کبھی واپس نہیں آ سکتے۔ مگر ان لمحوں کی
سہانی یادوں کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔

وہ دن زندگی کے اندھیرے میں اب بھی ستاروں کی طرح
چمک رہے ہیں۔ جیسے بہت سے جگنوؤں کو پکڑ کر ان کی
مالا گوندھ کر اندھیرے میں لٹکا دی جائے۔ وہ ہمیشہ چمکتے
رہیں گے۔

وقت کا اتنا طویل عرصہ طے کرنے کے باوجود یہ باتیں کل
کی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ ۱۱

فریدہ! انسان بڑا مجبور ہوتا ہے وہ جس بات کے تصور سے گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی اسی کے آگے سر تسلیم خم بھی کر دیتا ہے۔ مجبوری سب انداز سکھلا دیتی ہے اور انسان دوزخ سے بھی آہستہ آہستہ مانوس ہو جاتا ہے۔ نشاط رفتہ کے عہد و پیمان اور نادان کی چند آرزوؤں کی طرح گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے کسی کو کبھی نہیں چاہا تھا۔ طرب رفتہ کی بھولی بسری یادیں حسین خوابوں کی طرح بکھر کر رہ گئی ہیں۔ عہد ماضی کی گمنام راہوں سے بھٹکتی ہوئی آتی ہیں۔ اور دم توڑ کر رہ جاتی ہیں۔

فریدہ! تمہیں وہ سہانی شام یاد ہوگی۔ جب شبنم کی سالگرہ پر ہماری کوٹھی دلہن کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ چاروں طرف روشنیوں خوشبوؤں اور رنگوں کا طوفان امڈ رہا تھا۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ ہر چیز مسکرا رہی تھی اس روز منصور بھی آیا ہوا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں منصور سے پیار کرتی تھی۔ وہ بھی میری محبت سے باخبر تھا۔ اور مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا لیکن ہم نے ایک دوسرے سے کبھی اظہار محبت نہ کیا تھا

دلوں کے اندر ہی اندر پرورش پا رہی تھی اسی پھول کی
کی طرح جو اونچے پہاڑوں کی گہری اور عمیق گھاٹیوں میں
اگتا ہے اور روز بروز زیادہ سے زیادہ شگفتہ ہوتا جاتا ہے
لیکن جس کا کسی کو علم نہیں ہوتا ۔ منصور سے پہلی ملاقات
ہمارے کالج کے گیٹ والے پلاٹ میں ہوئی ۔ اس روز
وہ اپنی بہن روشی کا سرٹیفکیٹ لینے آیا ہوا تھا ۔ روشی امتحان
دے چکی تھی اور بیمار تھی ۔ میں اس کی سہیلی تھی ۔ منصور نے
مجھ سے پوچھا ۔

"معاف کیجئے گا ۔ آپ روشی کی سہیلی ہیں ناں ؟"

میں نے شرما کر کہا ۔

"جی ہاں "

"کیا آپ اس کا سرٹیفکیٹ دلوانے میں میری کچھ مدد کر
سکتی ہیں ؟"

میں ویسے تو بڑی شرما گئی ۔ لیکن چوں کہ وہ روشی کا بھائی تھا
اور روشی میری سہیلی تھی ۔ اس لیئے میں انکار نہ کر سکی ۔ میں
اسے ساتھ لے کر دفتر میں گئی ۔ اور اپنی پرنسپل سے ملوا دیا
اسی روز اسے تصدیق نامہ مل گیا ۔ اس نے میرا شکریہ ادا کرتے

ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بڑا شکر گذار ہوں۔ اگر آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو مجھے خاصی دشواری پیش آتی۔"

"شکریہ کی کیا ضرورت ہے یہ تو میرا فرض تھا۔"

اس کے بعد وہ جانے لگا۔ وہ مڑ گیا۔ میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر وہ اچانک واپس مڑا۔ اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں سہم گئی۔ کیوں کہ میں بھی اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی —— اس کی کیا ضرورت ہے!"

"معاف کیجئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح آپ کا چہرہ خوبصورت ہے۔ اسی طرح آپ کا نام بھی حسین ہوگا۔"

میں شرم سے عرق عرق ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کو اپنا نام ہرگز نہیں بتاؤں گی۔"

"تو میں گھر جا کر روشی سے پوچھ لوں گا۔"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور چپکے سے وہاں سے واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ منصور چلا گیا۔ گیٹ پر سے

باہر نکلتے ہوئے اس نے گردن پھیر کر ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ ہماری نگاہیں ایک پل کے لئے ایک دوسری سے ملیں۔ منصور مسکرایا اور چلا گیا۔ میں بھاگ کر اندر چلی گئی۔۔

دوسری بار اس سے میری ملاقات کالج کی سالانہ تقریب پر ہوئی وہ اپنی بہن روشنی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ گرمیوں کی وہ ایک بڑی ہی دلفریب شام تھی۔ بارش کے بعد موسم بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادلوں نے سنہرے آنچل اوڑھ رکھے تھے۔ ایک گلابی سی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ منصور نے بوسکی کی قمیض اور سرمئی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں سرخ رنگ کا مفلر تھا۔ اس کا چہرہ شام کی گلابی روشنی میں یاسمین کے پھول کی طرح مسکرا رہا تھا اور گلاب کے شگوفے کی طرح تر و تازہ ہو رہا تھا۔ روشنی نے اس کا تعارف کروایا۔

"نیلوفر! یہ میرے بھائی منصور ہیں۔"

منصور نے مجھے سلام کیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ میں اسے جانتا ہوں۔ بہت دیر سے۔ بہت عرصے سے

جانتا ہوں میں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور خاموش ہو گئی۔

جیسے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ کھانے کے بعد سب لڑکیاں ادھر ادھر درختوں کے نیچے ٹہلنے لگیں۔ منصور بھی ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں جان بوجھ کر منصور سے دور دور رہی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ میں ایک جھاڑی میں سے یاسمین کے نیلے نیلے پھول توڑ رہی تھی۔ کہ اچانک منصور سامنے آ گیا اور بولا۔

"اگر برا نہ مانیں تو میں پھول پیش کر دوں؟

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے یاسمین کے پھول توڑ کر ایک گلدستہ بنایا اور مجھے پیش کرتے ہوئے بولا۔"

"اگرچہ یہ ایک ناچیز تحفہ ہے لیکن اس میں میری محبت کی خوشبو ہے۔ قبول فرمائیے!

میں نے گلدستہ جلدی سے تھام لیا۔ اور وہاں سے بھاگ گئی۔ میرا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ میرا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ میرا رنگ خوشی اور شرم سے سرخ ہو رہا تھا

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔

اس رات مجھے نیند نہ آئی اور خواب میں میں نے منصور کو دیکھا کہ وہ اسی طرح یاسمین کے پھولوں کا گلدستہ ہاتھوں میں لیے مجھے پیش کر رہا ہے۔ میں نے گلدستہ لے لیا ہے اور اب منصور نے اپنا بازو میری کمر کے گرد حمائل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں کے بالکل قریب لا کر کہہ رہا ہے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں نیلوفر! میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ میں تمہاری پوجا کرتا ہوں میں تمہاری خوشبو ہوں اور تم میرا پھول ہو۔ ہمارا وجود ناگزیر ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ضروری اجزا ہیں۔ نیلوفر! نیلوفر! نیلوفر!!!"

میرا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ منصور کے سانس کی خوشبو میرے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہونٹ گلاب کے شگوفوں کی طرح کھلے ہوئے تھے اچانک اس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

میں لرز اٹھی اور میری آنکھ کھل گئی۔

میرے ارد گرد چاروں طرف رات کی تاریکی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ رات کی ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی کوٹھی کے لان میں درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ گھاس پہ شبنم گر رہی تھی اور فضا چپ چاپ تھی۔ مجھے کتنی دیر تک نیند نہ آئی۔ میں جاگتی رہی۔ جاگتی رہی۔ اور منصور کے بارے میں سوچتی رہی۔

اس کے بعد منصور سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ اور پھر میری بہن کی سالگرہ کا دن آگیا۔ تمہیں یاد ہے فریدہ سالگرہ کی رات کو ہماری کوٹھی پہ کتنی رونق تھی۔ روشنی بھی آئی ہوئی تھی۔ بھائی جان کے دوست بھی مدعو تھے۔ لان میں قمقمے جگ مگ کر رہے تھے۔ میں نے بہترین لباس پہنا ہوا تھا۔ اور تم نے کہا تھا۔

"نیلو! آج تو تم بالکل دلہن معلوم ہو رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری سالگرہ ہے آج"

میں نے منصور کو دیکھ لیا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ لان میں ایک جانب بیٹھا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ میں

نے اسے دیکھا اور دل کو تھام کر رہ گئی۔ میرا دل اپنے آپ دھڑکنے لگا۔ مجھے اس رات کا خواب یاد آگیا۔ چائے کے بعد میری سہیلیاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ ہماری کوٹھی کے لان میں پچھلی جانب چنبیلی کا ایک پودا ہے۔ تمہیں یاد ہے ہم اس پیڑ کے نیچے بیٹھکر کالج کا کام کیا کرتی تھیں۔

بہار کے پر فضا دن تھے۔ ہر طرف خوشبو پھیلی ہوتی تھی چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبوئیں آپس میں بغلگیر ہو رہی تھیں۔ میں اکیلی اپنے لان کے عقبی حصے میں آگئی اور چنبیلی کے پیڑ کے پاس آکر رک گئی۔ چنبیلی کے پیڑ پر چنبیلی کے سفید سفید پھول ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں نے ابھی جھاڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا۔ کہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

منصور نے میرے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔

"میں ہوں نیلو! منصور!"

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگی لیکن منصور نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور آہستہ سے اپنی طرف کھینچ کر کہا۔

"ابھی نہ جاؤ نیلو! ابھی تو میں نے اپنی محبت کا پہلا باب بھی شروع نہیں کیا۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ منصور نے آہستہ سے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور مجھے اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

"میں — میں تم سے پیار کرتا ہوں نیلوفر! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آئی۔ یہی جی چاہتا ہے کہ تمہارے پاس آکر تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لوں اور اپنا دل تمہارے قدموں پر رکھ دوں"

میں چپ چاپ بت بنی کھڑی تھی۔ میرے ہونٹ کسک رہے تھے۔ میری قوت گویائی ختم سی ہو گئی تھی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"تم خوشبوؤں کا جنگل ہو نیلوفر! تمہارا ریشمی ملبوس مجھے سنہری خوابوں کے جزیروں میں لے گیا ہے۔ میں تمہارے جنگل کا سورج ہوں نیلوفر! میری محبت سورج بن کر طلوع ہوتی ہے میری محبت نے طلوع ہو کر تم کو اپنی روشنی میں لپیٹ

لیا ہے۔

منصور کی باتیں اتنی دلکش اور مدھ بھری تھیں کہ میں دم بخود سی ہو کر رہ گئی۔ مجھ پہ گویا اس کی باتوں نے جادو کر دیا میں کچھ نہ بول سکی۔ منصور نے آہستہ سے میرے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

مجھے یوں لگا۔ جیسے میں نے گلاب کے پھولوں کے ڈھیر میں اپنا منہ چھپا لیا ہو۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میرا جسم گرم ہو کر دہک اٹھا۔ منصور نے مجھے اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اور اپنے سینے سے لگا لیا۔

"میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں نیلو! تم میری محبت کا محور ہو۔ میری محبت کا چاند تمہارے گرد سرگرم سفر ہے۔ تم میرے دل کی دھڑکن ہو سورج اپنی کرنوں سے بچھڑ سکتا ہے۔ چاند اپنا رخ بدل سکتا ہے۔ ستارے انگور کے گچھوں کی طرح زمین پہ گر سکتے ہیں۔ گھاس سمندر کی تہوں میں اگ سکتا ہے۔ لیکن میری محبت میں فرق نہیں آ سکتا۔ میری محبت کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ میں تمہارا

ہوں اور سدا تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ازل ہے ابدی ہے۔ میں تم سے اپنی محبت کی غذا حاصل کرتا ہوں۔ یہ دھرتی سورج کے گرد چکر لگانے سے رک سکتی ہے۔ لیکن میری محبت کبھی نہیں بدل سکتی۔ بنیھو! تم میری ہو میں تمہارا ہوں میں تم سے کبھی جدا نہیں ہوں گا۔ تمہیں کبھی اپنے آپ سے جدا نہیں کروں گا۔،،

منصور باتیں کر رہا تھا۔ اور میں آنکھیں بند کئے اپنے خواب کی سہانی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بیداری میں بالکل وہی ہو رہا تھا۔ جو اس روز خواب میں ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ لان کے درختوں کے عقب میں گول پر اسرار سرخ چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اور باغ میں درختوں کے نیچے اندھیرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔،

پھر چاند ادھر بلند ہوتے ہوتے رک گیا اور سفیدے کے ایک درخت کے پیچھے سے جھانک کر ہمیں ایک دوسرے سے ہم آغوش دیکھنے لگا۔ زمین نے اپنی گردش ملتوی کر دی۔ ہوا نے اپنا سانس روک لیا۔ چاندنی نے اپنے روشن

چراغ نیچے کر لیے۔ اندھیرے نے اپنی تاریک نیلی آنکھیں بند کر لیں۔ قوس قزح کی دھاری سے اس کے سارے رنگین پھول رات کے سیاہ جوڑے پر گر گئے۔ پھر اچانک لان کی طرف سے کسی نے مجھے پکارا۔ میں جلدی سے منصور سے الگ ہو گئی۔ اور بھاگ گئی۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔ ہونٹوں پر محبت کے پہلے بوسے کا نشان پھول بن کر خوشبو اڑا رہا تھا۔ اور چاند بن کر چمک رہا تھا۔

اچھا اب خط لکھنا بند کرتی ہوں۔ باقی دوسرے خط میں لکھوں گی۔

ہمیشہ تمہاری

نیلوفر

۲

دکھی دل محبت کا جھوکا ہوتا ہے۔

میرا دل اپنے معاشی اور سماجی مسائل سے پریشان تھا۔ دکھی تھا۔ اگرچہ گھر میں مجھے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ کسی نے کبھی مجھے کسی بات سے روکا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی میرے گھر والوں نے مجھے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اگر روتی تو وہ اسے میری مسکراہٹ خیال کرتے ہیں مسکراتی تو انہیں میری مسکراہٹوں کے پھولوں پر آنسوؤں کے قطروں کا گمان ہوتا۔ یہی میرا سب سے بڑا دکھ اور زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا منصور پہلا انسان تھا۔ جس نے میرے دل پہ ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکنوں

کو گننے کی کوشش کی تھی مجھے سمجھنا چاہا تھا۔ اور میرے دل کی دھڑکنوں پر رقص کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ میرا ہو جانا چاہتا تھا۔ اور میرے نقش قدم کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتا تھا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ نیلوفر کی آنکھوں میں جلتے بجھتے ستارے ہیں۔ اور ہونٹوں پر مدفون محبت کی ہچکیاں ہیں اور آنکھوں سے خزاں نصیب آرزوئیں ندیاں بن کر بہہ رہی ہیں۔

اس نے میرے کان پر ہونٹ رکھ کر کہا۔

"میں تمہاری زندگی میں اپنی زندگی کو گم کر دینا چاہتا ہوں نیلو! میں تمہاری راہ گذر پر اپنی آنکھیں بچھانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہاری روح کو پہچانتا ہوں۔ میں تمہاری خوشبو کی ہر لہر سے واقف ہوں۔"

میں نے منصور کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور شانے سے شانہ ملا کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

دوسری ملاقات میں میں نے منصور کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اس روز بارش ہو رہی تھی۔ منصور نے خط لکھکر مجھے بلایا۔ ہم دونوں شہر سے باہر ایک باغ کے ہوٹل میں ملے۔ ہم دونوں کیفے کے کیبن میں بیٹھے تھے۔ منصور نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور

سرگوشی میں بولا۔

"نیلو! محبت زندگی کے باغ کا سب سے بڑا اور مہکتا ہوا پھول ہے۔ میں یہ پھول توڑ کر تمہارے قدموں پر رکھتا ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ کیا تم اس پھول کو قبول کرتی ہو؟"

میں پہلے تو کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ ترچھی نگاہوں سے منصور کی طرف دیکھتی رہی۔ دل دھڑکتا رہا۔ ہونٹ کپکپاتے رہے۔ آنکھوں میں ستارے سے ناچتے رہے۔ نگاہوں میں رنگ برنگے پھول لہراتے رہے۔ منصور نے میرا ہاتھ چوم لیا۔

"نیلو! تم خاموش کیوں ہو؟ ۔ تم بولتی کیوں نہیں ہو! کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہاری محبت کے موتیوں کو اپنی جھولی میں سمیٹ لوں؟"

میں کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ سر جھکائے منصور کی باتیں سنتی رہی۔ دل میں ہزاروں باتیں تھیں۔ مگر ہونٹوں پر جیسے تالے سے لگ گئے تھے۔ زبان چپ تھی اور ایک بھی بول منہ سے نہیں نکل رہا تھا۔

منصور نے کہا۔

"تم چپ ہو اور میرا دل ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ میں
اس خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ نیلو! مجھے
بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ کیا تم مجھ سے محبت
کرتی رہو گی؟ کیا تم اس وقت مجھے یاد کرو گی جب
تمہیں سوائے اپنے اور کسی کا خیال نہیں ہو گا۔؟
کیا تم اس وقت مجھے یاد کرو گی؟ جب رات خاموش
ہو گئی اور ستارے آہستہ آہستہ ڈوب رہے ہوں
گے؟ کیا تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرتی رہو گی؟
کیا کبھی مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟"

پھر میں خاموش نہ رہ سکی۔ میں نے آہستہ سے پلکیں اٹھا کر منصور کو دیکھا اور سر جھکا کر کہا۔

"میں اگر کوشش بھی کروں تو تمہیں نہیں بھلا سکتی۔"

منصور بے تاب ہو اٹھا۔

"تم — تم سچ کہتی ہو نیلو! کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

"واقعی منصور! بالکل سچی محبت — اس محبت کا بیج اسی روز میرے دل میں پھوٹ پڑا تھا جس

روز میں نے پہلے روز نہیں کالج کے گیٹ پر دیکھا تھا۔

منصور نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس نے میرے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور مہر محبت ثبت کر دی۔ میں اپنے گویا ہوش میں نہ رہی تھی۔ مجھ پر ایک طرح کی بے خودی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ ایک طویل بوسے کے بعد منصور نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

"نیلو! دیکھو باہر بارش ہو رہی ہے"۔

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ تو واقعی باہر بارش ہو رہی تھی تیز اور موسلا دھار بارش ——— مجھ پہ کپکپی سی طاری ہو گئی۔

بارش کے ساتھ مجھے تاریک جزیروں میں چھپے ہوئے گھنے جنگلوں کا خیال آ گیا۔ جہاں ویران اور ڈراونی راتوں میں دہشت زدہ چاند ڈرتے ڈرتے نکلا کرتا ہے۔ بارش کی آواز مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے باہر چھجے پر گر کر شور مچا رہے تھے منصور نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور اپنا گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"آؤ اس بارش میں باہر نکل چلیں؟"

"میرے کپڑے بھیگ جائیں گے"۔

"پھر کیا ہوا۔"

"مجھے گھر بھی جانا ہے۔ منصور میں کپڑے بھگو کر گھر نہیں جا سکتی"

"تمہاری محبت میں ابھی تکمیل کی کمی ہے"

"تمہارا خیال ہے منصور! وقت تمہیں اس کا خود جواب دے گا۔"

"میں وقت کا انتظار نہیں کر سکتا"

"وقت اپنا انتظار خود کروا لیا کرتا ہے"

"میری محبت وقت کے بندھن سے آزاد ہے"

"محبت وقت سے ہمیشہ بے نیاز ہوتی ہے"

باہر بارش تیز سے تیز تر ہو گئی۔ منصور نے اس گرتی بارش میں مجھے بتایا کہ عورت قدرت کا ایک شاہکار ہے۔ یہ اس کی بہترین تخلیق ہے۔ اور حسین ترین تحفہ ہے۔ عورت حسن کی تکمیل ہے۔ عورت مرد کی تنہائی کی رفیق ہے۔ عورت بہن ہے۔ جو بھائی سے پیار کرتی ہے۔ عورت ماں ہے جو اپنے بیٹے پہ قربان بھی ہو جاتی ہے۔ عورت بیوی ہے۔ جو خاوند کی محبت کی دیوانی ہے۔ وہ اس کی اطاعت بھی کرتی ہے اور اس پہ حکومت بھی کرتی ہے۔

عورت ماں ہے جس کی گود میں انسان کی آئندہ نسل پھلتی پھولتی ہے عورت کا ایثار بے مثال ہے۔ وہ بچے کی پرورش میں اپنا سکھ چین عیش

آرام ۔ حسن و جمال خون و تندرستی ـــــ سب کچھ قربان کر دی ہے

عورت محبت کا دوسرا نام ہے ۔ اس کی محبت کا کوئی جواب نہیں
عورت مرد کے چہرے ہیں اور مرد کے حسن میں اپنی جاذبیت تلاش
کرتی ہے ۔ وہ اس کی باتوں پہ جان دیتی ہے ۔

جیسا کہ آسکر وائیلڈ نے کہا تھا ۔

" عورت کان کے ذریعہ سے پہ محبت کرتی ہے ۔ اور مرد
آنکھوں کے اعتبار پہ ـــــ "

قدرت کے سارے مظاہر پہ عورت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ یہ
سارے راستے ایک ہی شہر کی طرف جاتے ہیں ۔ نیلا گہرا آسمان اڑتے
ہوئے بادلوں کے ٹکڑے ۔ لال لال شفق ۔ جھلملاتے ہوئے ستارے
کھنچی ہوئی قوس قزح بھری رات کا چاند ـــــ دھیرے دھیرے بہنے والے
دریا ۔ اچھلتی بھاگتی ندیاں ۔ موجیں مارتا ہوا سمندر ۔ پہاڑوں کا سینہ چیرنے
والے آبشار ۔ کھجوروں کے جھنڈوں میں چھپے ہوئے میٹھے پانیوں کے
چشمے ـــــ "

برف پوش پہاڑیاں ۔ پھولوں بھری وادیاں ۔ ہرے بھرے لہلہاتے
کھیت ۔ رنگ برنگے فواروں کے کنج ۔ سفید براق کبوتروں کی
نیلے آسمان پہ اڑان ۔ درختوں سے لپٹی ہوئی نازک اندام بیلیں ۔ الجھی

الجھی ـــــ پگ ڈنڈیاں ۔ قلانچیں بھرتا ہرن کا بچہ ۔ جنگل میں بادلوں کی گرج سن کر ناچنے والا مور ۔ برساتی کی بھیگی راتوں میں چمکنے والے جگنو کوکتی ہوئی کوئلوں کی درد بھری آواز ـــ پھولوں پر منڈلانے والی خوش رنگ تتلیاں ۔ ٹھنڈے چرلھے میں رکھی ہوئی راکھ ۔

مندر کے چمکیلے کلس ۔ گرجا کے تکونے مینار ۔ مسجدوں کے سربلند مینار شہنشاہوں کے محلات ۔ شہزادوں کے مقبرے پہاڑیوں پر کھلے ہوئے پھول تراشا ہوا مرد کا مجسمہ ۔ شراب کی بوتل ۔ موتی کا آویزہ ۔ کسی آہو چشم دیو داسی آنکھیں ـــــ یہ سب چیزیں اگر ایک جگہ اکٹھی کر دی جائیں ۔ تو وہ عورت بن جائے گی ۔

عورت دنیا کی تنہا خوبصورتی ہے ۔

" دنیسلو ! میں نے نیلے آسمان کو درخشاں چاند کو جھلملاتے ستاروں کو اور قوس قزاح کو دیکھا ہے ۔ مہکتے پھولوں کو سونگھا ہے ۔ خوش رنگ تتریوں کو چھوا ہے ۔ مگر جو خوبصورتی جو حسن ، جو رنگ اور جو خوشبو تجھ میں ہے ۔ وہ مجھے کہیں نہیں ملی "

میں ایک عجیب خواب ایسے عالم میں رہنے لگی مفصور کی باتوں نے مجھ پر جادو کر دیا تھا ۔ مجھے بالکل بدل دیا تھا ۔

میری دنیا ہی تبدیل کر دی تھی۔ وہ کہتا ۔

نیلو! تمہارے چہرے میں چودھویں کا چاند جگمگاتا ہے تمہاری آنکھوں میں ستارے چمکتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں کھجوروں کے جھنڈ میں چھپے ہوئے میٹھے پانیوں کے شفاف چشمے ہیں تمہارے سینے میں پہاڑوں کا غرور ہے ۔ تمہارے ہونٹ، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سدا مہکتے ہیں ۔ تمہاری کمر میں ترناری کی بیل کی لچک کھڑی ہوئی ہے ۔ تمہارے ہونٹوں میں شفق کی سرخی ہے اور سرو نے اپنی بلند قامتی تمہارے قد کے حوالے کر رکھی ہے ۔ تمہاری آواز میں کوئل کی کوک ہے ۔ بلبل کا نغمہ ہے انگوروں کی مٹھاس ہے تم جب چلتی ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے لاکھوں مور ایک ساتھ ناچ رہے ہیں تم جب جھکتی ہو تو قوس قزح بن جاتی ہو ۔ تمہاری باہوں میں بلور جھنجھناتا ہے ۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب تم سامنے آتی ہو تو اس کائنات کی ساری خوبصورتیاں پیچھے ہٹ جاتی ہیں ۔ اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں ہیں ۔ اور میری نگاہوں کے سامنے صرف تم ہی رہ جاتی ہو ۔ میرے نصب العین کی آخری منزل تم ہو نیلو! تم ایک رات ہو اور رات نیلوفر ہے ۔ تم نہ ہو تو رات رات نہیں رہتی ۔ بلکہ ایک طویل اندھیرا بن جاتی ہے ،،

میں ان گیتوں کو بار بار سنتی اور منصور کی شیدائی ہو ہو جایا کرتی منصور نے اپنی اسی قسم کی والہانہ باتوں نے، انوکھی باتوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ میں بس اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اسے ہر روز ملتی۔ وہ ہر روز میری ملاقات کا شائق ہوتا اور میرا انتظار کیا کرتا اس نے کہا تھا کہ غم میں سنے گئے نغمے حسین ہوتے ہیں لیکن وہ نغمے جو ابھی تک نہیں سنے گئے حسین تر ہوتے ہیں میرے ہمدم! ساز کو چھیڑ اور میری روح کو اپنے سرمدی گیتوں سے جگا دے۔

ایک روز میں نے خواب دیکھا کہ چودھویں کا چاند ایک گھنے درخت کی ٹہنیوں میں محبوس ہو گیا ہے۔ ٹہنیوں کی تیز تیز سوکھی سوکھی نوکیں اس کے سارے جسم میں پیوست ہو گئی ہیں۔ اور درخت کے اس حصے سے زرد زرد خون کی روشنی کے فوارے چاروں طرف پھوٹ رہے ہیں میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ میرے ارد گرد خاموشی تھی۔ چاند درختوں کے اوپر چپ چاپ اپنا زرد چہرہ لئے کھڑا تھا۔ اور میری طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

کیسے پوچھ رہا ہو۔

کیا ہوا نیلو؟ تم ڈر کیوں گئیں؟

مجھے بائرن کی وہ سطر یاد آگئی۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ جنگل کے سایوں تلے دم لیتی ہوئی۔ دوشیزہ جب اپنے سینے سے آنچل اٹھا

دیتی ہے۔ تو آسمان پر چاند بھی اپنا راستہ بھول جاتا ہے۔

ہوا کا تیز جھونکا میرے کمرے میں آیا۔ اور کھڑکی کا پردہ اڑنے لگا درختوں کے پتے اور ٹہنیاں جھومنے لگیں۔ چاند کا آنچل لہرانے لگا۔ اور دور درختوں کی قطاروں میں کوئل کی کوک گونج اٹھی۔ اور میرے ذہن میں عجیب سے مناظر گھوم گئے۔ مہیب غار۔ گہری کھڈیں۔ بلند ثابت چٹانیں جو پیکر پہاڑ اور جھاڑ لاکھ درختوں سے بھرے ہوئے۔ لدے ہوئے جنگل اور شفاف پانیوں کے چشمے تیز رفتار پہاڑی نالے . . . . . !

پھر ہوا ایک دم رک گئی۔ ہوا کا زمردیں جھونکا جانے کس دیس کو نکل گیا اور میں کھڑی اُس کا منہ تکتی رہ گئی سارے ماحول پر ایک مہیب سناٹا طاری ہو گیا۔ مجھے یاد ہے۔

فریدہ! میں جب شملے گئی تھی تو ہم سنجولی میں رہا کرتے تھے۔ ہاں ہم گنجان کنجوں میں ندی کنارے سنگین چٹانوں پر پھرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی سرسبز پگڈنڈیوں پر دوڑیں لگایا کرتے۔ شرطیں لگا کر پہاڑوں کی چڑھائیاں چڑھتے سٹابری کے پودوں پر اتار اتار کر سٹابری کھاتے اور جب تھک جاتے تو ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتے اور شبنم آلود گھاس پر لیٹ جاتے۔ اور رات کو جب سب سو جاتے تو مجھے ایک طرف سے بنسری بجانے کی آواز آئی۔ پرانے ریسٹ

باہر کی طرف سے آواز آیا کرتی۔ میں کمرے میں بستر پر لیٹی چونک اٹھتی۔ باہر نکل کر دور دور تک دیکھتی۔ مگر وہاں کوئی چرواہا نظر نہ آتا۔ اداس دھندلی اور تھکی تھکی چاندنی میں رات کے پچھلے پہر بانسری کا درد بھرا نغمہ مہیب جنگلوں میں گونج اٹھتا۔ بلند قامت درخت اور کھنڈروں کے بوسیدہ ستون ساکت وجامد ستارے اور چاند . . . . ! وہ پھولوں سے لدی ہوئی سرسبز شاخیں ہنستی گاتی ندیاں اور نیلگوں آنکھوں والا وہ چہرہ جانے کہاں چھپ کر بانسری پر رات کا جادو جگا رہا تھا ؟

صبح صبح میں سیر کو جاتی۔ ڈھلان اترتے ہوئے چھوٹے چھوٹے نالوں کی سفید سی لکیریں سبزہ کے میدانوں میں کرنوں کی طرح نظر آیا کرتیں۔ آج تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ سب خواب کی باتیں تھیں۔

کبھی یہی باتیں روشنی بن کر میری آنکھوں کے سامنے بادلوں کے سفید سفید ٹکڑوں میں سے سورج کی سنہری شعاعیں بن کر چھوٹ کر نکلا کرتی تھیں شبنمی سبزہ زار پر ہلکی ہلکی دھند چھائی ہوتی۔ اس بھیگی فضا میں گویا زندگی کی ساری بہاریں سمٹ آتی تھیں۔

سرسبز وادیوں کے دل کش مناظر نادیدنی دسری ٹیلوں پر مسکراتی صبح و شام کی درخشاں کرنوں کا سماں۔ جھرنوں کی چمکتی سفید و نیلی نیلی دھاریاں۔ رات کی گہری تنہائی کا سکوت میرا ذوقِ جمال انہی دلفریبوں کا متلاشی تھا۔ جہاں رات اور دن کی خاموشی کا جادو

مصوری کا نیا روپ دے سکے۔ مجھے خوبصورت پہاڑوں سے پیار تھا۔ وادیوں کے دلفریب مناظر سے محبت تھی۔

ایک روز میں ایک پہاڑی کے باہر نکل گئی وہاں ایک قدیم کھنڈر نما عمارت تھی۔ یہاں ایک ہری بھری چراگاہ تھی۔ کھنڈر کی دیواریں شکستہ ہو چلی تھیں۔ مگر قدیم نقش ونگار کہیں اب بھی باقی تھے۔ دیواروں پر جنگلی پودے اُگ رہے تھے میں شکستہ زینے پر بیٹھ گئی۔ وہ دن بڑا اداس دن تھا۔ بادلوں نے تمام آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ کسی وقت ہلکی ہلکی پھوار شروع ہو جاتی۔ اور پھر بند ہو جاتی۔ اس مجبور و بے بس عورت کی طرح جو ضبط کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اپنی حالت پر قابو نہیں پا سکتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک جاتے۔

اور وہ جلدی سے انہیں سمیٹ لیتی ہے۔

میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ اداس اور تنہا دل میں کسی کی یاد تھی۔ کسی کا خیال تھا۔ لیکن وہ کون تھا۔ میں نہ جانتی تھی۔ شاید وہ منصور تھا۔ جو زندگی کے ایک دور میں ایک دوراہے پر ہاتھوں میں یاسمین کے نیلے پھولوں کا گلدستہ لیئے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اور جس کی جستجو کی آبشار میری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ پھر بارش شروع ہو گئی اور میں وہاں سے اٹھ کر چیڑ کے درختوں میں سے بھاگتی ہوئی واپس اپنے کاٹج میں

آگئی ۔ آج اس واقع کو چھ سال ہو گزرے ہیں ۔ مگر یوں لگتا ہے جیسے چھ
گھنٹے پہلے کی بات ہو۔ وقت ہمیں کس قدر دھوکا دے جاتا ہے ۔

—— = - - -

۳

بڑی دیر سے متواتر بارش ہو رہی ہے۔

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ہوا بڑے خوفناک انداز میں چل رہی ہے یوں لگتا ہے گویا یہ بارش اب کبھی نہیں رکے گی۔ انگوروں کی بیل ابھی تک شکستہ دیوار کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا آپ بار بار دیوار سے پٹخ رہی ہے۔ اور ہر طوفانی جھونکے کے ساتھ اس کے زرد پتے الگ ہو کر گیلی زمین پر گر پڑتے ہیں اور بارش کا پانی انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ آج کا دن کس قدر سرد اور ویران اور اداس ہے۔ یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے زندگی کی تیز رفتاری کبھی نہیں تھمے گی۔ کہیں نہیں رکے گی۔ سردیوں کے بعض

دن بڑے بے کیف اور ویران ہوتے ہیں۔ جب وقت سے کالج سے آئی ہوں بند کمرے میں صوفے پر شالی لے کر پڑی ہوں۔ آج سارا وقت میں چائے پیتی رہی ہوں۔ اب میں دوسرے کمرے میں کھڑکی کے پاس آتشدان کے سامنے آ کر بیٹھ گئی ہوں۔ آج نیند بھی نہیں آ رہی۔ آج نیند نہیں آئے گی۔ آج تمام رات جاگ کر بسر کرنی ہوگی۔

طویل اور بے خواب رات۔

یہ رات ہولے ہولے بھاگ جائے گی۔ جب زندگی میں ایسے بھیگے بھیگے دن آتے ہیں۔ تو میری طبیعت بڑی پریشان ہو جاتی ہے۔ میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ پڑھ بھی نہیں سکتی۔ بس میرا دل چپ چاپ بیٹھ کر۔ اکیلی بیٹھ کر رونے کو چاہتا ہے۔ روح بہت گھبراتی ہے۔ اکیلے بیٹھنے سے تو اور بھی وحشت، ہونے لگتی ہے۔ چاروں طرف گہری خاموشی طاری ہے۔ صرف بارش کا شور ہے اور کچھ نہیں سنائی دے رہا۔ بوندیں مسلسل گر رہی ہیں اور وقت کی سرد برف کی سِل میں سوراخ کرتی جا رہی ہیں۔ ان کی مسلسل ٹپ ٹپ فضا کو اور بھی بوجھل اور وحشت ناک بنا رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس رات کی کبھی صبح نہیں ہوگی۔

کبھی سورج طلوع نہیں ہوگا۔

....

منصور نے میری زندگی کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔ اس کی باتیں میری زندگی کا وہ موڑ بن گئیں جہاں سے دھوپ میں چمکتی ہوئی سرسبز وادیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ میرا دل اس نیلے آسمان کی طرح ہو گیا۔ جہاں سے گدلے گدلے بادلوں کو ہوا اڑا کر لے گئی ہو۔ اور اب گہری چمکتی دھوپ چمک رہی ہو۔ منصور کی باتیں اور اس کے خط اس مقدس تالاب کی طرح تھے۔ جہاں تھکے ہوئے مسافر آ کر تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے محسوس کرنے پر مجبور کر دیا۔ کہ میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے۔ چھوٹا سا جو میری تخلیق میں پنہاں ہے۔ اور جسے پورا ہونا ہے۔ میں اس محفل میں ایک پیام لے کر آئی ہوں اور جب تک وہ پیام سنا نہیں دیتی مجھے آرام سے نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

اس کے خطوط میں لکھے ہوئے مہربان الفاظ میرے دل کے اندر زندگی کی گرم اور روشن قندیلیں جلا دیتے۔ وہ مجھے ایسے گیت سناتے جو میں نے آج تک نہیں سنے تھے۔ ایسے مناظر دکھاتے جو میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔ وہ میری تاریک رات میں سورج کا پہلا اجالا تھا۔

ہماری محبت ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے اور آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بدنامی کی سرحد آ گئی۔

لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ رشتہ دار باتیں بنانے لگے منصور نے مجھے لکھا۔

پریشان مت ہونا بنسلو! یہ وقتی سیلاب ہے گذر جائے گا۔ میں تم سے اسی طرح محبت کرتا ہوں۔ جس طرح آبشار سے پہاڑ محبت کرتا ہے۔ تم میری روح کا جوہر ہو۔ ہم دونوں ایک دریا ہیں۔ اور ہماری محبت موجوں کی محبت ہے چوں کہ ہم دریا ہیں۔ اس لیے اس میں کبھی بھنور آتے ہیں۔ کبھی سیلاب اٹھتا ہے۔ کبھی طغیانی بڑھتی ہے اور کبھی سکون آجاتا ہے۔ تمہاری پریشانی میرے لیے انتہائی دردناک ہے جب تک ہم ذہنی بندھن کو توڑیں گے نہیں۔ اس وقت تک ہمارے لیے نسیم سحر بھی موجۂ صرصر سے کم نہیں ہے اگر تم یہ فیصلہ کرلو کہ آنے والا طوفان تمہاری نظر یا فکر کو متاثر نہیں کر سکتا تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ بلکہ ہم اسے دم بھر کی گرم لو سے تشبیہ دیں گے۔ جو بہرحال چلتی اور تھم جاتی ہے،،

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ رت بدلتے دیر نہیں لگا کرتی۔ اور میں آج تک محض بے بنیاد خواب دیکھتی چلی آئی تھی۔ ہائے کیسے خواب جن کی تعبیریں کبھی شرمندہ معانی نہ ہوئی تھیں۔

مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میں ریت کے گھروندے بنا رہی تھی۔

بے بنیاد گھروندے - جو فطرت کی ایک ہی ٹھوکر سے زمین پر آن گرے۔ منصور مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ کم از کم اس نے مجھ کو یہی یقین دلایا تھا۔ لیکن جب بدنامی زیادہ ہونے لگی اور میرے والدین نے مجھے متنبہ کر دیا۔ کہ میں منصور سے ملنا جلنا بند کر دوں۔ تو میں منصور سے چھپ کر ملی۔ منصور سے میں نے کہا کہ میں ہر حالت میں اسے ملتی رہوں گی اور اس قسم کی باتوں کو خاطر میں نہیں لاؤں گی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ منصور زیادہ محتاط ہو جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں ماں باپ کی باتوں پر چلوں اور اس سے کم ملا کروں۔ بدنامی نہیں ہونی چاہیئے۔ میں حیران ہو گئی۔ پھر بھی مجھے خیال نہ آیا کہ منصور در اصل میری جوانی سے کھیلنے کی ایک بھیانک چال چل رہا ہے اور اسے مجھ سے نہیں بلکہ میرے جسم سے دلچسپی ہے اور میرے جسم کا رس نچوڑ کر وہ مجھے پھینک کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے

میں نے منصور سے کم ملنا شروع کر دیا۔ جب ذرا بدنامی کم ہوئی۔ تو منصور نے خط لکھ کر مجھے بلایا۔ وہ اپنے ایک دوست کے گھر میں مجھے لے گیا۔ وہاں سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ اس روز منصور کا چہرہ زرد تھا۔ اس کے چہرے پر جو سرخی اور روحانیت ہوا کرتی تھی۔ وہ مفقود تھی۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے منصور! تم پریشان سے دکھائی دیتے ہو؟"
اس نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔
"نہیں تو۔ بالکل نہیں"
ہم دونوں اکیلے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ منصور کی آنکھیں ہلکی سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آگیا۔ اس نے مجھے اپنی آغوش میں دبوچ لیا۔ آج اس کی گرفت انتہائی مضبوط تھی۔ میں کانپ گئی۔
"کیا کر رہے ہو منصور؟"
"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ صرف محبت کر رہا ہوں"
میں ڈر گئی اور کچھ کچھ سمجھ گئی۔ منصور نے میری کمر دبوچ لی اور مجھے پلنگ پہ گرا لیا اور میرے ساتھ وہ بھی میرے اوپر گر پڑا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"تم نے مجھے بڑا شدید ذہنی صدمہ پہنچایا ہے۔
منصور! مجھ پر تمہاری زندگی کا بڑا گھناؤنا رخ کھلا ہے"
منصور کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ پھر اٹھ کر بولا۔
"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری جان! میں تمہاری محبت میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔"
اس کے بعد میں نے منصور سے بہت کم بات کی اور جلدی اٹھ کر

گھر واپس آگئی۔ دوسرے روز منصور کا بڑا لمبا چوڑا خط آیا۔ اس خط میں اس نے مجھ سے اپنی گستاخی کی معافی مانگی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تین روز بعد ایک اور خط آیا۔ اس خط میں اس نے اپنی محبت کا سمندر بہا دیا تھا۔ میں نے جواب میں کہا۔

"تمہارے طرز عمل نے مجھے بڑا مایوس اور اداس کر دیا تھا۔ منصور شاید تم سمجھتے ہو کہ محبت ایک آبخورہ ہے۔ جسے چاہا تو فرش مسجد پر رکھ دیا۔ اور چاہا تو میکدے میں لے گئے۔ میں تمہاری شخصیت کے اس تضاد کو بالکل نہیں سمجھ سکی۔ تم حسن اور بادے کے بہاؤ میں بہتے جا رہے ہو لیکن میرا ذہن حسن کے ساتھ ہے۔ عزت و احترام کے ساتھ ہے منصور!

تمہیں تو اس طرح زندگی بسر کرنی ہے جس طرح فطرت کا حسن لالہ زاروں میں نشوونما پاتا ہے۔ اس روز مجھے اپنے اردگرد چاروں طرف وسیع قبرستان نظر آ رہا تھا۔ قبریں ہی قبریں۔ امیدوں آرزوؤں کی قبریں۔ میں گھر آ کر یوں پڑ گئی۔ جیسے کھوئی ہوئی پندار! جیسے بیاباں میں کھجور کے درخت کا کمزور سایہ! کسی پُر درد نغمہ کی دھن۔ کسی نوجوان کی تربت پر مرجھایا ہوا پھول۔ یا کسی آغاز کا دردناک انجام!

منصور! ماضی کے قبرستانوں میں گھومنا چھوڑ دو۔ صرف میرے تصور کے ساتھ میرے ساتھ دور نکل چلو۔ سورج نکل آئے تو ہم ستاروں

کا ذکر نہیں کیا کرتے۔ محبت اس قسم کی باتوں سے مِٹ جایا کرتی ہے
سچی محبت دیری ناگ کے چشمے کی طرح ہمیشہ بہتی ہے اور ہمالیہ کی طرح
سر بلند رہتی ہے۔

میں تمہاری وہی باتیں سننا چاہتا ہوں جو نیلگوں جزیروں سے شروع
ہو کر انگور کی بیل پر ختم ہو جاتی ہیں۔ تم نے جو میرے دل میں محبت کے
دیپ روشن کئے ہیں۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے بجھانے کی کوشش نہ
کرو۔ یہ سراسر ظلم ہو گا۔ مجھ پر اور میری محبت کے روشن چراغوں پر!
وعدوں کے سفینے ڈبونے کی کوشش نہ کرو۔ جذباتی آدمی شکست
کھانے کے بعد زندگی سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ مرد شراب پیتا ہے
عورت گھل گھل کر کھیلتی ہے۔ اور وقت تماشہ دیکھتا ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

باٹرن کا قول ہے کہ جس کام کے بارے میں مغالطہ ہو اس کو اسی
وقت کر ڈالو۔ جن معاملات میں تمہیں شک ہو ان کو اسی لمحہ پر رکھ لو جب
سورج یکساں رفتار پہ نہیں رہتا تو وہ خیالات کس طرح یکساں رفتار میں چل سکتے
ہیں۔ جو بہر حال کسی وقتی تاثر کا نتیجہ یا کسی لحاتی جذبہ کی پیداوار ہوتے ہیں
دنیا جدوجہد کا اعتراف نہیں کرتی جب تک کہ صحیح نتیجہ سامنے نہ آ
جائے۔"

....

منصور اب مجھ سے دور دور رہنے لگا۔ میری محبت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور منصور مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگا۔ وہ اب مجھے کبھی کبھار خط لکھتا اور بہت کم ملتا۔ لیکن میرے وہم میں بھی ایسی بات نہ آئی تھی کہ منصور ایک روز مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔

اور مجھے ایک روز اسے لکھنا پڑے گا کہ منصور! اگر تمہیں یونہی کرنا تھا تو پھر تم میری زندگی میں آئے ہی کیوں؟ میرا دل چاہتا ہے کہ سارا سارا دن جنگلوں ویرانوں میں اکیلی اور تنہا تنہا پھرتی رہوں۔ جانے یہ زندگی مجھے کہاں لے جائے لیکن ابھی تو میں اس کی محبت میں سرشار تھی۔

ابھی تو میں اسے لکھا کرتی

منصور! تمہاری محبت کے پھولوں سے دھیمی دھیمی مہک کی پھوار اڑ رہی ہے۔ مجھے یہ مہک بڑی پسند ہے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس وقت میرے ذہن میں کن کن ملکوں کی کیسی کیسی تصویریں گھوم رہی ہیں ان میں ہالینڈ کے بارش میں بھیگے ہوئے دیہاتی مکان اور ان کی پراسرار گلیاں ہیں۔

Ah! THAT WAS A soug

To semem lier

پیرس اور دی آنا کے قہوہ خانے ہیں۔ رنگوں کی خوبصورت برسائیں مجورا اور رامیشورم کے پرانے مندر ہیں۔ اور ان مندروں میں رقص کرتیں کالی کالی آنکھوں والی دیوداسیاں ہیں اور کولمبو کے سرخ پھولوں والے درختوں سے گھرے ہوئے بازار ہیں۔ لنکا کے جنگل اور جانے کیا کیا کچھ ہے ذہن کن خیابانوں میں آوارہ گردی کر رہا ہے۔

میں نے ہمیشہ ایک سنہری زمانے کا خواب دیکھا ہے۔ جب انسان اور اس کی مسرت کے درمیان کوئی دیوار حائل نہیں ہوگی۔

اور وہ پر معصوم اور پاکیزہ خوشی کا بانہیں پھیلا کر خیر مقدم کرے گا۔ سائنس اور ترقی نے ہمیں سب کچھ دیا ہے۔ لیکن روحانی خوشی اور روحانی سکون ہم سے چھین لیا ہے۔

آج سے چار ہزار سال پہلے کا انسان سائنس کی نعمتوں سے محروم تھا لیکن وہ روحانی طور پر پُرسکون تھا اور مسرور تھا۔ اور زیادہ دیر تک خوش وخرم زندہ رہتا تھا۔

میں بھی آج سے چار ہزار سال پہلے کی لڑکی ہوں۔ میں بھی صحت مند مسرور اور جی بھر کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کرو روح کو پھر سے زندہ کرو۔ اس لیے کہ موت ہمیں ذرا سی بھی مہلت نہیں دے گی۔ میں تمہیں تاریخ کے اس سنہری دور کی عظمت کیسے بتاؤں جب لوگ

غیر ضروری تکلفات اور تفکرات و پریشانیوں سے آزاد تھے۔ جب کینگی، دھوکہ بازی اور ریاکاری ایسے الفاظ سے کوئی واقف نہیں تھا۔ جب لوگ کبوتروں اور چڑیوں کی بجائے تیتروں کا شکار کیا کرتے تھے۔

جب کلوپیٹرا زندہ تھی۔ جب غرناطہ اور اندلس زندہ تھے۔ جب ایسفہر کے باغات میں سنگمرمر کے چبوتروں پر بیٹھ کر پھولوں اور تاروں کی چمک میں زندگی کو آسان اور خوبصورت بنانے کے انداز پر غور و فکر کیا جاتا تھا۔ جب انسان کو روٹی اور پر سکون گھر اور بچوں سے زیادہ اور کچھ نہیں خواہش ہوا کرتی تھی۔

آج انسان ترقی و تہذیب کے عروج پر ہے۔ لیکن اس کے باوجود، بدنصیب اور پریشان حال ہے۔ ہم نے جھوٹے اخلاق کی زنجیریں بنا کر خود اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں۔ ہمارا جسم روحانی مسرت کے لیے تڑپتا ہے۔ لیکن خودساختہ جہنم کے شعلوں میں جلتا رہتا ہے۔ میں ان لوگوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ جو ہمیں علم کی جہالت سے روشناس کروائیں گے جو ہمارے جسموں سے کرم خوردہ کتابوں کو باہر پھینک کر وہاں گلاب اور موتیے کے پھولوں کے بیج بکھیر دیں گے۔ منصور! صبح کی نرم ہوا اور گلاب کی ایک پنکھڑی دنیا کی بڑی سے بڑی کتاب پر بھاری ہے تم بھی پھولوں سے محبت کرو اور خود بھول جاؤ۔ ذہن کو غیر ضروری پریشانیوں اور برُے خیالات

سے پاک کر لو۔ چاندنی کے بارے میں چاند بن کر سوچو سورج کے بارے
میں سورج بن کر غور کرو، پھول سے پھول کی زبان میں بات کرو ہوا کے گلے
میں باہیں ڈال کر اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے جاؤ۔ خوشبو کو پھول کی
پنکھڑی سے اڑتے دیکھو اور ستاروں کے ساتھ جاگ کر انہیں جھلملاتا ہوا
دیکھو۔ اور جب سورج طلوع ہو تو وہ تمہیں بستر پہ نہیں بلکہ سبزے پر آنکھیں
کھولے دیکھے۔

....

۴

باہر باغ میں رات کے آخری ساعتے مدھم ہو رہے ہیں۔

شاید آسمان پر بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہوا میں نمی سی ہے بڑی پر اسرار سی خاموش رات ہے۔ اگر یہی رات کسی بلند و بالا پہاڑ پر ملتی تو اس کے خاموشش حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں پر سوئی ہوئی رات کسقدر سحر انگیز ہوتی ہے۔ کوہستانی چاندنی کے آبشاروں میں غسل کرتی ہوئی دودھیا رات!

رات کی خاموشی اور غمگین تنہائی میں میرے دل کے اندر کئی قسم کے شبہات کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ چاند کھڑکی کے باہر نور کی آبشار گرا رہا تھا

پھر اس نے اپنا سفر مشرق کی طرف آسمان کے آخری کناروں کو چھو کر ختم کر دیا۔

ہلکی ہلکی نیلگوں چاندنی کا حسن ہر شے کو مسحور کئے ہوئے ہے ہم نے سوچا تھا کہ ہم اوس کی نیلی نیلی دھند میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر ایک ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے گیت گاتیں گے۔ مگر وہ رنگ اڑ گئے اور وہ سورج کہیں ڈوب گیا۔ اب میں اس دنیا میں اکیلی ہوں اور کہکشاں کے نورانی ستونوں کے سہارے کھڑی ہوں۔ اور جہاں چاندی کے درختوں پہ سونے کے پرندے نغمہ خوانی کر رہے ہیں اور رات کو پریاں چاندنی کے ساز پہ طلوع آفتاب کا گیت گاتی ہیں اور کنول کے پھولوں میں لپٹ کر سو جاتی ہیں۔

ساری رات کھڑکی میں بیٹھی باہر باغ میں بارش کے گیت سنتی رہی ہلکے ہلکے اندھیرے میں ہلکی ہلکی بارش کی آواز یہ سب بڑے پراسرار بڑے اجنبی اور البیلے ہوتے ہیں۔ جانی پہچانی چیزیں انوکھا روپ دھار لیتی ہیں سردیوں کی لمبی خالی اور بارانی راتوں میں ــــ جب ہم ریشمی لحاف کے اندر دبکے ہوں۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہو۔ بالکل ایسی۔ جیسی پریوں کی خواب گاہوں میں ہوا کرتی ہے کھڑکی کے پیچھے پہ بارش کے قطرے جلترنگ بجا رہے ہیں

اور انگور کی بیل ٹھنڈے پانی میں غسل کر رہی ہے۔ ہماری محبت کی پہیلی پر رات کی تاریکی کے داغ نہیں پڑنے چاہئیں۔

کاش وہ دن پھر سے واپس آجاتیں۔ وقت کا سمندر ان بیتے دنوں کے موتیوں کو اگل دے۔

کل میں نے اپنی زندگی کے مرغزاروں میں ان پھولوں کو سنہری دھوپ میں کھلتے اور مہکتے دیکھا۔ جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلے تھے۔ جو اس سے پیشتر کبھی نہ مہکے تھے۔ میرے ماضی نے کسی گمنام جزیروں کے زمردیں ساحلوں سے مجھے آواز دی تھی۔

. . . .

یہ ان بہاروں کے مزار ہیں۔ جو درختوں اور چشموں کو سدا چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ یہ اسی خزاں کے پھول ہیں جو زرد پتے اڑاتی وادیوں میں آئی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی اور یہ اسی حنا کے شعلے ہیں۔ جو وہ محبت کرنے والوں کی جواں مرگ انگلیوں پہ نثار کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ہم کسی پرانے قبرستان میں گھوم رہے ہیں کھنڈروں میں بھٹک رہے ہیں۔ جہاں پہ دوسرے قدم پر کوئی نہ کوئی افسردہ کتبہ ہمیں ان بہاروں کی یاد دلاتا ہے۔ جو خشک اڑتے پتوں کا ڈھیر چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی۔

اور منصور نے لکھا کہ نیلو! تم قدرت کا نکیہ کلام ہو جیسے فطرت پھولوں اور چاندنی راتوں کا ذکر کرتے ہوئے بار بار دہراتی ہے۔ تمہارے کمرے میں یہ آواز گیت بن کر داخل ہوتی ہے اور میرے کمرہ کے ہر گیت پہ کسی کی فریاد کا گمان ہوتا ہے۔

چاندنی میں روشنیں چمک رہی تھیں۔ اس چمکیلے سکوت میں بے زبان سی اداسی رچی ہوئی تھی۔

ہماری محبت نے ابھی پہلی بہار بھی نہ دیکھی تھی کہ اسے خزاں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر ہم ایسے جزیروں میں پہنچ گئے۔ جہاں پھولوں کے رنگ پھیکے جا رہے تھے اور ان کی رنگین پنکھڑیاں الگ کی جا رہی تھیں جہاں سورج سے اس کی ساری کرنیں واپس لی جا رہی تھیں۔ یہ صدمہ میرے دل پر نہیں بلکہ میری لاش پر سے گذر گیا۔ چاہتی ہوں کہ ان پریشان کن خیالات کو اپنے دماغ کی سیاہی میں سے چائے کی باسی پتیوں کی طرح نکال کر باہر پھینک دوں۔

اور اب تو مجھے مکمل طور پر جینا آ گیا ہے۔ یہ تین سال میں نے کس طرح گذارے یہ ایک بڑی ہی لمبی کہانی ہے جسے اگر بیان کرنا شروع کروں تو شاید لوگ سنتے سنتے اکتا جائیں گے۔ ہر سال ایک چھپا نک پہاڑی کی طرح تھا۔ جس کی برفیلی چوٹیاں دھند میں گم تھیں اور جس کی ،

گھاٹیوں میں خاردار جنگل پھیلے ہوئے تھے۔

اور منصور کی محبت انسانی جذبہ کی پیداوار تھی۔ وقتی تاثر کا نتیجہ تھی اس وقت میں اداس ہوں اور مجھے تمہارا خیال آ رہا ہے میں ایسے عالم میں ہوں۔ جہاں ہر سمت اداسیوں کے کھنڈرات سلسلہ در سلسلہ پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جہاں کوئی آواز نہیں۔ ایک اداس خاموشی مسلط ہے۔ وادیوں کے پرندے گنگ ہیں اور چشموں کی آواز ڈوب گئی ہے مجھے ضدی وحشی اور سرکش چیزیں بے حد عزیز ہیں۔

فیض کا ایک شعر ہے۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

آج تک اسے سرسری نظر سے پڑھتی رہی تھی اب اس کے اصل معانی معلوم ہوتے ہیں۔ نومبر کی خنک ہوائیں۔ خشک شام کے دامن میں مچل مچل رہی تھیں۔ سورج دور بادلوں کی سلطنت میں چلا گیا تھا۔ اور ڈوبتی کرنیں خطے بہ خطہ عجیب ابھرتے نقش بنا رہی تھیں سورج کے گھرے سایوں میں دبے دبے قدم اٹھاتا چل رہا تھا تنہائی کا لبادہ اوڑھے زندگی اجاڑ اور ویران پگڈنڈیوں پر رواں دواں تھی۔

میرے منصور! تم نہیں آئے اور یوں محسوس ہوتا ہے وقت کا کارواں

کہیں جا کر کھو گیا ہے۔ کہ لمحات گزرنے ہیں ہی نہیں آتے۔ سب ہی تمہیں یاد کرتے ہیں۔ سوچتی ہوں یوں خزاں نصیب فضاؤں میں کب تک زندہ رہ سکوں گی۔

محبت تمہاری پرواز میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ منصور! اور تم نے مجھے یقین دلایا کہ تم صرف مجھ سے محبت کرنے کے لیے ہی اس دنیا میں پیدا ہوئے ہو۔ تم نے اپنے آپ کو اور مجھ کو کتنی شدت سے دھوکا دیا۔

میرے لیے محبت تو ایک چپ تھی کہ میرے ہونٹوں پہ جم کر رہ گئی تھی۔ ایک اداسی تھی۔ جو میری آنکھوں میں نوحہ گر تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک لڑکی ابھرتی اس مشرقی آب و ہوا میں پلی ہوئی ایک لڑکی۔ جو شہر کے اندرونی حصے میں تنگ و تاریک گلیاں پار کر کے کھلے راستوں سے ہو کر پر فضا مقام پر وسیع سبزہ زاروں اور رنگ افروز مناظر کے خواب دیکھتی ہے۔ کھلی آنکھ کے خواب امید افزا۔ یہ خواب اگر زندگی گزارنے والے انسان عموماً تلخ حقائق پہ پردہ کرنے سے گریز کیا کرتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکی صرف اتنا ہی نہیں کر سکتی بلکہ تھوڑا بہت عملی کام بھی سر انجام دے رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس لڑکی کے رگ و پے میں رچی ہوئی محبت کے خون کا رنگ

سیاہی مائل ہے۔

اس رنگ میں حالات کی تلخیوں نے سیاہی گھول دی ہے اور اب اس خون کی گردش اکثر اوقات اس کی سنہری دوپہروں کو سنولا دیتی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسی حالت میں اس لڑکی کی جھکی ہوئی گردن اور ڈھلکے ہوئے کندھے مجھے اس کے بالکل قریب لاتے ہیں

اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اسے اپنی روح کی ساری تازگی دے دوں اور اپنے سینے کی تمام پاکیزگی سونپ دوں اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے اٹھاؤں اور پیٹھ تھپتھپا کر کہوں کہ دیکھو سامنے ایک راستہ ہے جس پر دھوپ بھی ہے اور چھاؤں بھی۔ غم سے نڈھال ہونا بزدلی اور خوشی سے پھولے نہ سمانا کم ظرفی ہے زندہ رہنے کے لیے غم خوشی کے شانہ بشانہ چلنا ہے۔

مگر میں سوچتی ہوں کہ یہ ساری باتیں وہ خود بھی جانتی ہے۔ وہ پھر دن اپنی شامیں اداس کر کے گذارتی ہے۔ چھت کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ تو پھر کیا ہو؟ کیا ہو!

سوال کی بدستور گونج قائم ہے ایک گونج جو پریشان کرتی ہے ایک گونج جو سوچ پر مجبور کرتی ہے۔ اور ایک گونج جو مستقبل کے روشن

دلوں کی جھلکیاں دکھاتی ہے اور میں اُس الجھن میں گھر کر کبھی ٹمٹما اٹھتی ہوں اور کبھی بجھ جاتی ہوں۔

پھر سوچتی ہوں کہ جب زندگی اتنی مختصر ہے کہ اسے چھوٹے سے چھوٹا حادثہ ختم کر سکتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ اسے کہساروں اور دیاروں کے درمیان گھوم کر بسر کیا جائے۔ مجھے ابھی جنگلی پھولوں سے ڈھکی ہوئی چراگاہوں میں ریوڑ چرانے ہیں۔

ان دیکھے خوابگوں جزیروں میں آنکھ مچولی کھیلنی ہے کہسانی چاندنی کی آبشاروں میں غسل کرنا ہے اور درختوں کے جھنڈوں میں بجنے والے جھرنوں کے گیت سننے ہیں۔

تم مجھے سمندر میں تیرتے ہوئے سیپ کی طرح مل گئی ہو۔ جس کا سینہ دہکتے ہوئے بیش قیمت موتیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ اور میں نے ان تمام موتیوں کو اپنے میں جذب کر لیا ہے اور میرا سینہ یوں منور ہو گیا ہے جیسے میرے دل کے عقب میں چاند طلوع ہو رہا ہے۔ میرے "تاریک سمندر میں گمشدہ زمردیں جزیرے کی طرح میرے سامنے ابھرتے ہیں۔

لیکن اب تم مجھ سے کوسوں دور ہے۔ اتنی محبت سے اتنے پیارے خط اور میٹھی باتیں کہنے والا آج مجھ سے ہزاروں برس کے فاصلے پر کسی اجنبی اور ویران ستارے میں بیٹھا ہے اور مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا۔

یہ سوگ یہ کرب۔ یہ بے کلی یہ اضطراب میری روح کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ میری یادوں کے سوگوار جنگل میں آج بھی ان سدا بہار پھولوں کے کنج مہک رہے ہیں۔ میں نے زندگی کے پرشور ماحول میں مختلف آوارگیوں کو جا پہنچا ہے۔ ہمارے ماحول میں یہ مفلوج حرکات آزاب کہلاتی ہیں۔

ایک دریائے الفت ہی سہی میں لیکن
اب کسی چشم عنایت کا سہارا بھی نہیں

دنیا کی تلخ ترین حقیقتوں کے درمیان میں نے اس بات کو محسوس کیا کہ محبت کرنا پھر جدائی کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب جانا۔ کبھی بھی محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔

میں نے اپنے دل میں تمہاری نگاہ کی بے قراریاں بھری نہیں۔ مجھے اس اعتراف میں پشیمانی کی خلش محسوس نہیں ہوتی۔ میری فضائے ذہنی پر ایک ستارہ سحری طلوع ہوا۔ اس کی نرم روشنی کا مدھم اجالا میرے وجود کے ذرہ ذرہ پر چھا گیا۔ اس کی مبہم کرنوں کی نازک لرزشیں میرے دل کی دھڑکنوں میں سمٹ گئیں اس کی پیشانی سے اڑتا ہوا رنگ میرے غم کا دوست بن گیا۔

میں نے اس کی غمناک متلاشی آنکھوں کو سرگرداں پایا۔

وہ ایک غم تھی مجسم! ایک اداسی تھی مکمل۔ ان کی نگاہوں میں ایک الم تھا۔ ایک غم تھا۔ میری تمام ہستی ان آنکھوں کی بے پناہ گہرائیوں میں ڈوب چکی ہے۔ میں یہ دن جس درد و کرب سے گزار رہی ہوں اس کے لیے الفاظ کا سہارا کافی نہیں ہوگا۔

مجھے تو ہوش نہیں تم کو یاد ہو شاید
کہ لوگ کہتے ہیں تم نے مجھے تباہ کیا

گانے کی آواز اتنی رسیلی اور درد بھری ہے جیسے سرشام ہی صحرائے سنسان میں دور سے آتی ہوئی موسم ابر نشگال کی ہوائیں قریب سے دبے پاؤں گذر رہی ہیں۔ اس کا اندازہ ممکن نہیں۔

دنیا میں اس سے بڑا اور کوئی دوزخ نہیں جب ایک عورت اپنا جسم کسی دوسرے کو سونپ دے اور اس کا دل کسی دوسرے کی محبت میں تڑپ رہا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میری زندگی اس دہکتے ہوئے گرم گرم کوئلے کی طرح بن کر رہ گئی جسے پانی میں ڈال کر بجھا دیا گیا ہو۔

آسودگی کے ساحل کے کلب میں بیٹھ کر سمندر کی لہریں گنتی رہتی ہوں۔ آوارگی ان

میں گڑ جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو انسان کی دکھ بھری زندگی پر گہری نظر نہ رکھتی ہو۔ اسے تو احساس شکستہ نے اداس کر دیا تھا۔

. . . .

مجھے تو ہر واقعہ متاثر کرتا ہے اور ذہن کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے زندگی کے بارے میں میرا زاویہ نگاہ اور عورتوں سے مختلف ہے میری شخصیت کا فنکارانہ پہلو ابھی تک تشنہ ہے اور شاید یہ ہمیشہ تشنہ رہے مجھے دولت نہیں چاہیئے۔ مجھے امارت نہیں چاہیئے امیروں کے پاس صرف دولت ہوتی ہے اور غریبوں کے پاس دل کی دولت ہوتی ہے۔ جو ہر اعتبار سے انمول ہے دولت سے امیر لوگ عالیشان محل بناتے ہیں۔ عیاشیاں کرتے ہیں اور ان پتھروں میں انسانوں کو کچلتے ہیں۔ مگر جب کوئی غریب دل کے زخم پر مرہم رکھتا ہے تو خوشی سے آنسو نکل آتے ہیں۔ پارس کے چھو جانے سے لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے۔ زندگی کے یہ لمحے کس قدر عزیز اور خوشگوار ہوتے ہیں اور کتنے مختصر۔ عورت اگر کوشش کرے تو وہ کہکشاں کی چادر میں لپٹے ہوئے تاروں کو نوچ سکتی ہے۔ ہم دونوں سمندر کی لہروں کی طرح ایک ہی ساحل کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں

ایک ہی تال پر رقص کر رہی تھیں ۔ لیکن ہمارے درمیان آرزوؤں کی ٹیکسلا مسمار ہو چکی تھی ۔ اسے ابھی تک کوئی نہیں کھود سکا

۵

کیا میں کبھی بھی اس کے ہمراہ زندگی بسر نہ کر سکوں گی؟

اگر نہیں تو پھر جذبات کی شدت اس نقطۂ عروج تک پہنچنے کے بعد محرومیوں کی طرف مڑے گی تو کیا ہوگا؟ دو لبریز پیمانے جب ٹکرائیں گے۔ تو کیا چھلکیں گے بھی نہیں؟ نہیں نہ صرف یہ کہ چھلک پڑیں گے بلکہ پاش پاش ہو جائیں گے۔ پھر جب اس کی شادی ہو چکی ہے اور سماجی اعتبار سے وہ میرا نہیں ہو سکتا۔ کاش منصور تم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ۔ تمہاری ایک بیوی بھی ہے جو تمہارا انت،

تمہاری راہ دیکھا کرتی ہے۔ اور جب تم مجھ سے محبت کا اظہار کرتے ہو۔ تو وہ گوش بر آواز ہوا کرتی ہے۔ اور جب تم میرا منہ چومتے ہو تو اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ جایا کرتے ہیں۔

کیا یہ بہتر نہیں کہ میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں جذبات کی رو میں یہ کر عمر بسر نہیں کی جا سکتی تم بھی مجھے بھول جاؤ گے تم نے تو پہلے ہی سے مجھے بھلا دیا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ تمہیں بھی روحانی اذیت پہنچے گی۔

کچھ سزا تجھے بھی بھگتنا پڑے گی۔ جسم کی مادی ضرورتیں روح کی تمام بلندیوں کو تہ و بالا کر دیتی ہیں جسم سے مجبور ہو کر روح جھک جاتی ہے۔ اور وقت اپنے تقاضے پورے کراتا ہے۔ جب ناکامیاں وقت کا آخری سرا چھو لیتی ہیں تو انسان محبت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

دھندلے مستقبل سے نگاہیں موڑ کر حال کی طرف چاہے کتنا ہی اندھیرا کیوں نہ ہو متوجہ ہو جاتا ہے اور پھر اسی میں باقی زندگی بسر کر دیتا ہے۔ کچھ تو اس لیے کہ اندوہِ عشق کی کشمکش اس کے تمام وجود کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اور طبیعت اسی کے ایسی انخودہ ہو جاتی ہے کہ مزید تاب خستگی نہیں رہتی۔ کچھ اس لیے کہ امید موہوم کا سہارا لے کر جیے جانا بھی

کا کام نہیں۔

دنیا کی بے درد حقیقتیں جسم کی ورزدیت کو ختم کر دیتی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر تیار ہیں۔ ماں باپ کی خوشی ہوتی ہے جس کے آگے لڑکیوں کو مجبوری کی قربان گاہ پر چڑھا دیا جاتا ہے،، اور باقی عمر وہ قید میں بسر کر دیتی ہیں۔ ایسی ہی عمر قید مجھے بھی دی گئی ہے۔

لیکن میرے جسم کے کچھ حصے اس قید کی زنجیر سے الگ ہو گئے ہیں۔ میری روح اب بھی بے زنجیر ہے۔ بے داغ ہے میرا دل اب بھی پاک ہے۔

انسان جب اپنی خواہش کے خلاف دوسرے کا پابند ہو جائے تو اس پر عامیانہ نقوش سادے بے رنگ کے باوجود اس میں انفرادیت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔

میں نے جب پہلے پہل تمہیں دیکھا تو میرے جسم کے رنگ نکھر گئے روح کے خلا پُر ہو گئے۔ زندگی کے بہت سے تاریک زاویے جگمگا اٹھے دھم خانے چمک اٹھے۔ اور ایک ایسا دھیما اجالا پھیل گیا جس نے میری زندگی میں نئی کسک پیدا کر دی۔

غم کی وسعتوں میں لذت ہوتی ہے۔

مجھے اس دھیمی دھیمی چاندنی میں ایک ہلکا سا غم گھلا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ تمام عالم غم کی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ میں اس غم آلود خنکی میں پڑی رہتی ہوں یہاں تک کہ میرے اعصاب پر ماحول پر اور تمام کائنات پر ایک رنگین

اضملال کا ہلکا سا عکس چھا جاتا ہے۔ میں اس غم میں ڈوب جاتی ہوں۔

تمہارے بغیر زندگی میں ایک ایسا خلا ہے۔ جیسے اور دوسری خوشیاں کبھی پر نہیں کر سکتیں۔ تمہاری نگاہوں میں اتنی محرومی سمٹ کر کہاں سے آگئی ہے۔ کیوں ہے! تمہاری تحریر میں وہی محرومی وہی غم ناک گداز ہے۔ وہی پریشان خیالیاں اور بے تابیاں ہیں۔

کون جانتا ہے کہ میرے کن نا...گے تبسم شبی کے عوض تم سے گفت گو کے یہ چند لمحات مجھے میسر آئے ہیں؟ کاش! یہ لمحات پھیل کر ساری حیات پہ چھا جائیں۔ تاکہ جب یہ نہ رہیں تو میں نہ رہوں۔

. . . .

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کالج میں جایا کرتی تھی۔ تو مجھے رستے میں ایک کمسن لڑکی ملا کرتی تھی۔ میں اسے مسلسل ایک سال سے ایک چوک کے قریب دیکھتی۔

خدا جانے کب صبح کو وہاں آتی اور کب رات کو واپس اپنے گھر جاتی۔ لیکن مجھے یوں لگتا۔ جیسے وہ ایک سال سے وہیں کھڑی ہے۔ اس کی عمر کوئی چھ سات سال کے قریب ہوگی۔ آنکھوں سے وہ اندھی تھی۔ اس کی قسمت میں اندھیرا ہی اندھیرا۔ اسے روشنی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے کاندھے

پر ایک ٹھیلا ہوتا - اور تھیلے میں دیا سلائیاں - دو چار دیا سلائیاں دو ہاتھوں میں پکڑے ہوتی تھی - اور وہ اسے بیچ رہی ہوتی تھی - وہ ایک خوددار لڑکی تھی - جو بھیک مانگنے پہ موت کو ترجیح دیتی تھی -

وہ اندھی تھی - وہ بڑی آسانی سے بھیک مانگ سکتی تھی - لیکن وہ ایسا نہیں کرتی تھی - وہ دیا سلائیاں بیچ کر اپنا گذارہ کر رہی تھی - اس کی حالت دیکھ کر مجھے بڑا خیال آتا - کہ آخر قدرت نے اسے کس قصور کی بنا پہ آنکھوں سے اندھا کر دیا ہے -

اور اس پہ یہ غریبی اور افلاس ! - وہ بے چارگی اور مجبوری کی مکمل مثال تھی - مجھے یوں لگتا جیسے وہ زبان بے زبانی سے ہر جانے والے کو پکار پکار کر کہتی ہے کہ جانتے ہو میں یہ دیا سلائیاں کیوں بیچ رہی ہوں؟ تم شاید سمجھ سکو - مگر اس لیے کہ تم ان دیا سلائیوں سے ان بڑے بڑے محلوں کو آگ لگا دو - ان اونچے اونچے ایوانوں کو جلا کر راکھ کر دو - آخر تم کرتے کیوں نہیں ! اگر تم لوگ آج جھجک رہے ہو تو کل کو تمہیں ایسا کرنا ہوگا - میں بھی جب تک سانس لیتی ہوں - دیا سلائیاں بیچتی رہوں گی - تم ! جو سارا دن محنت کرتے ہو - اس کے عوض تمہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی - اور وہ —— وہ امیر لوگ —— جو دنیا میں محض عیش و عشرت کے لیے آتے ہیں ان کے

دسترخوان کے کتے بلکہ زبان کا چٹخارہ لیتے ہیں۔ کیا تم ان لمحوں سے
بھی گذرے ہو؟ لیکن اس کی یہ خاموش پکار کوئی نہیں سنتا۔
سب گذر جاتے ہیں۔ اور ہم بھی گذر جاتے!

. . . .

۶

بہار کا قیمتی آنچل! پلکیں لرزتے آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ اور آنسو کیسے گہرے اور جانگسل دکھ کے بوجھ سے دب کر قطرہ قطرہ ہو کر بہہ رہے ہیں۔

مجھے نرگس کے پھول پسند ہیں۔ کیوں کہ اس میں ایک صبر آزما انتظار سلگتا رہتا ہے۔ سندر اور نکھرا ہوا چہرہ دیکھ کر آغاز بہاراں کی ڈھلتی ہوئی کا خیال آجاتا ہے — عظمت، بزرگی اور سربلندی کا خیال۔ روشنی وسعت اور ہمہ گیری کا خیال۔

بسیرا۔ دھندلکوں کے دامن میں ابھی تک ایک جگمگاتی ہوئی

کرن کی منتظر تھی۔ جو میرے اندھیرے کو اجالے میں بدل دے۔ ...
حیات ایک شیریں رقص ۔ رقص جاوداں بن کر رہ جائے۔ کاش
میں محدود اور دم گھٹنے والی چار دیواری سے نکل کر زندگی کی وسیع
اور شاداب کھلی وادیوں میں سانس لے سکتی ۔

کہتے ہیں جب کسی چیز کی انتہا ہو جائے تو اس کی جگہ ایک ایسی شے
معرض وجود میں آجاتی ہے جو پہلے کے برعکس ہوتی ہے۔ بعض دفعہ
انسان سورج کو ڈوبے دیتا ہے۔ اور تاریکی کو بچا لیتا ہے۔ میں نے
محسوس کیا کہ پانی اپنی مسلسل روانی سے تنگ آکر خود ہوا کو دعوت
دے رہا ہے۔ کہ وہ اسے اڑا کر لے جائے کہ وہ اس کے سکون کو
درہم برہم کر دے۔ منتشر کر دے ۔ اور اس کے سینے میں
طوفان برپا کر دے

اس حسین دوشیزہ کی طرح جن کا حسن اسے مجبور کر دے کہ وہ کسی مرد
کے ہاتھوں جھنجوڑی جائے ۔ یا اس شوخ گل کی طرح جو چٹک کر بلبل کو
دعوت دے کہ وہ اس کی پنکھڑی پنکھڑی نوچ کر بکھیر کر رکھ دے ۔

زمانے کا دست قدرت محبت تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک
محبت کرنے والے اس انتشار کو اپنے اوپر مسلط کئے ہوئے ہیں
جب ہم دو دل ایک ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے

سے جدا نہیں کر سکتی ۔

جو رشتہ خوشی کے بندھن میں نہیں بندھا ہوا۔ اسے مجبوری کی زنجیر سے باندھے رکھنا خلافِ عقل ہے۔ خوشی کا جہنم زبردستی کے جنت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔

دنیا والے تو صرف چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن چہرے کے اندر اس کی روح میں جھانکنا ان کے بس کی بات نہیں۔ کسی کی نگاہیں بھی میرے ظاہری خدوخال سے آگے نہیں بڑھیں کسی نے بھی میرے روح کی عظمت کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔

یہ کہ مجھ میں کیا کیا صلاحتیں پوشیدہ ہیں۔ اور یہ کہ صرف میری رفاقت ہی کسی کی زندگی کو چمکا سکتی ہے۔

باتوں کا فریب چہرے کے فریب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے

بگلے کے اجلے پروں کو دیکھکر دریا کے بطن سے جانور دھوکا کھا جاتے ہیں۔ دھوکہ دینے سے دھوکہ کھانا زیادہ بہتر ہے۔ دھوکہ دینے والا پریشان ہوتا ہے۔ اور دھوکہ کھانے والا مطمئن ہوتا ہے۔

جھوٹ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے ۔ وہ سچ کبھی نہیں بن سکتا۔

. . . .

دل میں تیرا خیال آیا ہے ؛

یا کوئی پھول مسکرایا ہے ۔

ستاروں کی معصوم بستی سے گھسیٹ کر کسی نے مجھے حقیقت کی تلخ دنیا میں پھینک دیا ہے ۔ ستاروں کے اداس گیت فضا کی وسعتوں میں پھیل رہے ہیں ۔ میں ان سب پر خط تنسیخ کا آنچل ڈال دینا چاہتی ہوں اور اب ان کی زیر نقاب مسکراہٹ کا جائزہ بھی نہیں لینا چاہتی ۔ اس کے موتیوں سے سجے ہوئے وہ مناظر جانے کن وادیوں میں کھو گئے ہیں ۔ مدھم روشنی میں، نیم مدہوش راتوں اور گاتی ندیوں کے ترنم میں جھومتے ہوئے گیت جانے کن فضاؤں میں کھوتے گئے ہیں ۔ پاکیزہ خیالات ہی پاکیزہ زندگی کے حامل ہوتے ہیں ۔ پھر بھی ہم شریک حیات بن کر ایک ساتھ چلنا چاہتے تھے ۔

لیکن منصور بھاگ گیا ۔ وہ چلا گیا ، طوائف کے عشق کی طرح اس کی باتوں کا موضوع بدلتا گیا ۔ انسان قانون اپنے لیے نہیں ۔ بلکہ ہمسائے کے لیے بناتا ہے ۔

۲

گرمیاں آگئیں۔ رات گرم اور دن ویران ہو گئے۔

میں پہاڑ پر چلی گئی۔ تمہیں یاد ہے فریدہ! میں پہاڑ سے تمہیں خط لکھا کرتی تھی۔ یہ پہاڑ ہمارے شہر سے کوئی ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر تھا۔ اور اس کی وادی بڑی خوبصورت تھی اپنی والدہ کے ساتھ وہاں ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھی۔ ہمارا ریسٹ ہاؤس جہاں تھا۔ وہاں چاروں طرف چنار کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ رات کو بارش ہوتی تو درختوں میں شور سا مچ جاتا۔ صبح سورج نکلتا تو چنار کے سرخ پتوں میں گویا آگ سی لگ جاتی۔ ہمارے پاس ہی ایک چشمہ تھا۔ یہ چشمہ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ میں ہر روز صبح اس چشمے پر منہ ہاتھ دھونے

جایا کرتی تھی۔ میرا دل یہاں آکر کچھ کچھ بہل گیا تھا۔

منصور کی تلخ یاد دل سے محو ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں چاہتی بھی یہی تھی کہ اس بے وفا کو جتنی جلدی ہو سکے بھلا دوں۔

ایک روز میں صبح سویرے چشمے پر منہ ہاتھ دھونے گئی۔ پرسش کرنے کے بعد میں تولیے سے منہ ہاتھ پونچھ کر واپس پگ ڈنڈی پر چلی آرہی تھی کہ اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی۔

میں ڈر گئی۔

اچانک منصور میرے سامنے آگیا۔

"نیلوفر!"

میں گویا سکتے میں آگئی۔ میں اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ منصور یہاں بھی آسکتا ہے۔ میں حیران سی ہو کر رہ گئی۔ منصور نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھامنا چاہا۔ میں نے پیچھے ہٹ گئی۔

مجھ سے دور نہ جاؤ نیلوفر! میں نے بڑی مشکل کے بعد تمہیں پایا ہے،،

میں چپ رہی۔ وہ پھر بولا۔

"کیا میں اب اتنا ہی برا ہو گیا ہوں، نیلو! کہ تم میرے سائے سے بھی دور بھاگتی ہو؟ میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارا ہوں اور ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔،،

میں نے ہونٹ سیکھتو کر کہا۔

"تمہیں جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں نیلو! میں تمہارے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ رہا ہوں"

"تمہارا دل جھوٹ کا پٹارا ہے۔ تم نے اس پٹارے میں بازی گروں اور شعبدہ بازوں کی چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔ آج تم مجھ سے محبت جتاتے ہو۔ اور کل کسی دوسری سے اظہار عشق کر رہے ہوتے ہو"

"تم نے مجھے غلط سمجھا ہے نیلو! میں صرف تمہارا ہوں۔ میں کائنات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے آج تک سوائے تمہارے اور کسی سے محبت نہیں کی اور نہ کر سکتا ہوں۔

میں تمہارا ہوں اور سدا تمہارا رہوں گا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ تمہارا سب سے بڑا جھوٹ ہے"

منصور نے سر پکڑ لیا۔

"اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے صرف تم سے ہی محبت کی ہے۔ نیلو اور کسی سے محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے جلدی سے کہا۔

"اب مجھے یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا دھارا موڑ لیا ہے۔ اپنی کشتی کا رخ پھیر لیا ہے۔ تم نے میری زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن خدا نے مجھے بچا لیا۔ تم نے اس وقت میرا ہاتھ چھوڑا جب مجھے تمہاری اشد ضرورت تھی۔ میں کس طرح اعتبار کر لوں کہ تمہیں مجھ سے محبت تھی۔

منصور نے ہاتھ مل کر کہا۔

میں مجبور ہو گیا تھا نیلو! میرے پاؤں جکڑ کر رکھ دیئے گئے تھے۔"

"مرد کے منہ سے مجبوری کا لفظ اچھا نہیں لگتا۔ اگر مرد بھی مجبور ہو جائے۔ تو اس کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے"

"تم نہیں جانتی نیلوفر! میری مجبوری کی دوسری نوعیت کی تھی۔"

"میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ یہی جان کر تمہاری پہلی بیوی اور اس میں سے بچے موجود تھے۔ آخر تم نے پہلے مجھ سے کیوں نہ کہا کہ تم نے مجھ سے محبت کرنے سے پہلے کسی اور سے اپنی زندگی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ مجھ سے دل ملانے سے پہلے تم کسی

اور کو اپنا دل دے چکے ہو "

"میں تمہیں پہلے کہتا۔ میں جانتا تھا، کہ جونہی تمہیں معلوم ہوا کہ میں شادی شدہ ہوں، اور چار بچوں کا باپ ہوں تو تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گی۔ اور پھر کبھی میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھو گی۔ اور یہ میں ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں زندگی سے ہاتھ دھو سکتا تھا لیکن تجھے اپنے سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں خاموش رہا۔

ایک دو بار میں نے سوچا بھی کہ تمہیں صورت حال سے باخبر کر دوں۔ لیکن تم اپنی محبت میں اتنی آگے نکل چکی تھیں، کہ اگر میں تمہیں اس وقت یہ خبر سناتا تو ہو سکتا تھا کہ تم پر سکتہ طاری ہو جاتا۔ اور تم وہ صدمہ برداشت نہ کر سکتیں "

" یہ تمہارا وہم تھا۔ بلکہ تمہارے دل کا چور تھا جس نے اصل بات کو مجھ پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ ورنہ تمہیں اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ میں سچائی پسند لڑکی ہوں اور سچائی کو ہر حالت میں ہر جگہ، ہر ماحول میں پسند کرتی ہوں۔ "

"تم اسے کچھ سمجھو۔ میری خود غرضی ہی سمجھ لو۔ بہر حال میں نے جو کچھ کیا اپنی محبت سے مجبور ہو کر کیا۔"

"اچھا اب جب کہ ہر شئے ختم ہو چکی ہے۔ تم میرا راستہ روکے کیوں کھڑے ہو! تم کیا چاہتے ہو؟"

منصور نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے چھڑانے کی کوشش کی مگر پرانی محبت عود کر آئی اور میں ایسا نہ کر سکی۔

"میں تم سے اپنی پرانی محبت کی ایک بار پھر بھیک مانگتا ہوں نیلو! خدا کے لیے مجھے پھر سے اپنی محبت کی روشنی عطا کر دو۔ میرے بجھے ہوئے سورج کو اس کی ساری کرنیں واپس کر دو میرے ماتھے پر سے گرے ہوئے چاند کو اٹھا کر پھر سے میری پیشانی پر لگا دو۔ میرے سارے خواب مجھے لوٹا دو"

"وقت گزر گیا ہے منصور! اب ایسا میں چاہوں بھی تو نہیں کر سکتی۔ ہرگز ہرگز نہیں کر سکتی۔ اب میرا دل خود اجڑ گیا ہے۔"

"ابھی دن پوری طرح نہیں ڈوبا نیلو! ابھی دن کی روشنی باقی ہے۔ ابھی شام نہیں ہوئی۔ ہم اگر چاہیں تو بیتی ساعتیں پھر سے واپس آ سکتے ہیں۔ محبت جب ایک بار دل میں جنم لیتی ہے۔ تو پھر کبھی ختم نہیں ہوا کرتی۔ محبت غیر فانی ہے۔ اور ہمیشہ غیر فانی رہتی ہے۔"

"میرا دل بجھ گیا ہے ۔ میرے دل پر تمہاری بے وفائی نے گہرا زخم لگایا ہے ۔ میں اس زخم کو ابھی تک اچھا نہیں کر سکی ۔ اور شاید ساری زندگی اسے اچھا نہ کر سکوں"

"میرا دل بھی ٹوٹ گیا ہے نیلو! میں بھی تمہاری طرح آزردہ اور غمگین ہوں ۔ مجھے بھی اپنے غم میں شریک کر لو ۔ شاید ہم دونوں مل جائیں تو ہمارے غم کا مداوا ہو جائے"

"جو دل خود ٹوٹ چکا ہو وہ کبھی دوسرے کو کیا جوڑ سکے گا ۔

اب منصور نے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنا شروع کر دیا ۔

"نہیں نہیں نیلو! تم ایسا کر سکتی ہو ۔ کیوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو ۔ مجھ سے پیار کرتی ہو ۔ تم مجھے برابر یاد کرتی رہی ہو ......"

نہیں نہیں ایسا نہیں ہے ۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں ۔ تم نے مجھ سے بے وفائی کی تھی ۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں ......"

منصور آگے بڑھ رہا تھا اور میں پیچھے ہٹ رہی تھی ۔ وہ برابر میری طرف بڑھ رہا تھا ۔ اور میں برابر پیچھے چشمے کی طرف جا رہی تھی ۔ وہ کہہ رہا تھا ۔

"تم میری ہو ۔ تم سدا میری ہو ۔ اور میری ہی رہو گی ۔ میں تم

سے محبت کرتا ہوں۔"

اور میں کہہ رہی تھی۔

"وہ یہ بکواس ہے۔ جھوٹ ہے۔ میں تم سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ اور ساری زندگی نفرت کرتی رہوں گی"

میں چشمے کے کنارے چنار کے ایک بہت بڑے درخت کے ساتھ لگ کر رک گئی۔ منصور میرے اوپر آ کر جھک گیا۔ اس کا خوشبودار روانی سانس میرے رخساروں پہ چھونے لگا۔ مجھے پرانے دن یاد آ گئے جب میں اور منصور لاہور کے باغات میں سیریں کیا کرتے تھے۔ اور کیبن ہوٹل بیٹھکر چائے پیا کرتے تھے اور مال روڈ کی لمبی لمبی سیریں کیا کرتے تھے اور وہ ہماری کوٹھی کے لان والی خوبصورت شام یاد آئی جب منصور نے پہلی بار میرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھے تھے۔ پھر مجھے وہ خواب یاد آتا۔ جب میں نے منصور کو اپنے سینے سے لپٹے ہوئے دیکھا تھا۔ اور میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ منصور نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس نے میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے میں بے بس ہو گئی جنگل میں صبح کی میٹھی ہوا چل رہی تھی۔ پرندے چنار کے درختوں پر بیٹھے راگ گا رہے تھے۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ منصور کے ہونٹ

میرے ہونٹوں پر تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں چونک پڑی۔ میں نے جلدی سے اپنے آپ کو الگ کیا۔

"نہیں نہیں منصور! اب میں تم سے بالکل نہیں مل سکتی۔ تم مجھ سے ہزاروں میل دور ہو۔ تم میرے نہیں ہو سکتے۔"

—— ◦ ——

۸

میرے ارد گرد جنگلی پھولوں کی خوشبو اور چشمے کا گیت تھا۔ مجھ پر اس قسم کا منظر ہمیشہ جادو کر دیا کرتا ہے۔ مجھے ایسے حسن کی ہر جگہ تلاش رہتی ہے۔ شفق کی سرخی چاند کی کرنوں میں پھولوں کی خوشبو، شبنم کے قطرے، ستاروں کی چمک، بارش کے ہلکے ہلکے چھینٹے، دھنک کی رنگین قوس قزاح، کہکشاں کی پھیلاتی افشاں، ہواؤں کا ترنم، مرمریں آبشاروں کی گنگناہٹ، خواب کے ہلکے ہلکے رنگ — منصور کی باتوں نے مجھے پرانے دنوں کی یاد دلا دی۔ میں نے کہا۔

خدا کے لیے منصور مجھے مجبور نہ کرو۔ میں اب واپس نہیں آ سکتی۔ میں تم سے بہت دور نکل گئی ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو واپس نہیں آ سکتی۔

" ایسا نہ کہو نیلو ! تم ابھی تک وہیں کھڑی ہو۔ تم وہیں ہو جہاں میں تجھے چھوڑ گیا تھا۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد منصور کی محبت مجھ پر غالب آ چکی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سمجھ لیا کہ منصور میرا ہے اور وہ میرا ہی ہو کر رہے گا۔ منصور نے مجھے بتایا کہ وہ گرین کاٹج میں اکیلا ٹھہرا ہوا ہے۔ اور صرف میری خاطر پہاڑ پر آیا ہے۔

" کیا تم کل مجھ سے ملنے آؤ گی ؟"

" کہاں "

" میرے کاٹج میں !"

" اکیلی کیسے آسکتی ہوں ؟"

" جیسے پہلے آیا کرتی تھیں "

" کوئی دیکھ لے گا "

" یہاں دیکھنے والا اور کوئی نہیں "

" کوشش کروں گی "

" نہیں نیلو ! تمہیں آنا ہوگا۔

" اچھا کل آؤں گی "

وہ سارا دن اور ساری رات میں نے بے چینی سے گزار دی۔ منصور نے ایک بار پھر میری زندگی میں داخل ہو کر اسے تہہ و بالا کر دیا تھا۔ میں منصور سے نہیں ملنا

چاہتی تھی۔ کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا۔ پھر بھی میں اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ بات الگ تھی کہ میں نے اس کی محبت کو دبا رکھا تھا پھر بھی میں اسے زیادہ آگے بڑھنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ ایک شادی شدہ مرد سے ایک غیر شادی شدہ لڑکی کا عشق زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔

- - - - - - - - - - - - - - -

اس شام میں نے گھر بہانا بنایا کہ میں ایک سہیلی کی سالگرہ پر جا رہی ہوں۔ میں شال اوڑھ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور منصور کے کالج کا رخ کیا۔

منصور کا کالج ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ بڑا ہی چھوٹا سا اور پیارا کالج تھا منصور کالج کے پاس باہر کھڑا میری راہ دیکھ رہا تھا۔

" مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی "۔

" مگر زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گی "

" فکر نہ کرو جلدی ہی چلی جانا "۔

منصور مجھے اندر کمرے میں لے گیا۔ اس روز آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھا رہے تھے۔ اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ منصور نے کمرے میں ہیٹر لگا رکھے تھے۔ دونوں ہیٹر دہک رہے تھے اور کمرہ گرم ہو رہا تھا۔

" شال اتار دو نیلو! یہاں اتنی سردی نہیں ہے "۔

میں نے شال اتار کر دریچے پر رکھ دی۔ منصور اور میں دونوں ہیٹر کے پاس

بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

"میں بیان نہیں کر سکتا نیلو کہ مجھے تم سے مل کر کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اب دوبارہ تم سے ملاقات ہو گی"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کچھ پیو گی؟"

"کافی"

منصور نے جلدی سے کافی بنائی اور ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے کافی پیتے رہے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ بادل زور سے گرجنے لگے۔

"بارش ہونے لگی۔ میں واپس کیسے جاؤں گی"

"ابھی تو تم آئی ہو۔ ابھی سے واپس جانے کی فکر دامنگیر ہو گئی۔"

"مجبوری ہے۔ گھر بہانہ بنا کر آئی ہوں"

"پھر کیا ہوا"

"مجھے اس روز تو کام سا ہو رہا تھا۔ منصور نے کہا۔

"تم تھوڑی سی برانڈی پی لو تو اچھا ہے"

"نہیں اس کی کیا ضرورت ہے"

"برانڈی بڑی اچھی ہوتی ہے"

"تھوڑی سی پی لوں گی پھر"

منصور نے ایک گلاس میں جانے کتنی برانڈی ڈال کر مجھے زبردستی ساری کی ساری پلا دی۔ میں کچھ دیر تو بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر میرا سر چکرانے لگا۔

مجھ پر کچھ نشہ سا طاری ہو گیا۔

"منصور! یہ تم نے مجھے کیا پلا دیا ہے؟

"کچھ نہیں۔ برانڈی تھی۔ میں نے بھی تو پی ہے"

منصور بھی برانڈی پی رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے کوئی تین چار گلاس پی لیئے تھے۔ وہ میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اور اس کے ہاتھ کی انگلیاں میرے جسم کے نشیب و فراز گن رہی تھیں۔ میں نشے کی حالت میں تھی اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منصور کو روکوں یا خود بھی اس ندی میں بہہ جاؤں۔ آخر برانڈی کا نشہ رنگ لایا۔ میں بھی اس ندی کے بہاؤ میں بہہ گئی۔ منصور نے مجھے چومنا شروع کر دیا۔ اس نے مجھے اپنے آپ سے لپٹا لیا اور میں نے قمیض اتار دی۔

"بڑی گرمی ہے"

واقعی بڑی گرمی تھی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ ماتھا گرم ہو کر دہک رہا تھا۔ جسم انگارہ بن گیا تھا۔ میں نے قمیض اتار کر پرے پھینک دی اور صوفے پر لیٹ گئی۔ منصور مجھ پر جھک گیا۔ اور میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ مجھے پیار کرنے لگا۔

میں مدہوش سی ہوگئی۔ رنگ و روز کے سیلاب میں بہہ گئی۔ مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ باہر بارش ایک دم تیز سے تیز تر ہوگئی۔ پہاڑ کی بارش تیز ہوتی گئی اور بجلی بار بار چمکنے لگی اور بادل گرجنے لگا۔

"رینیسلو! تم میری ہو۔ تم کتنی سندر ہو"

منصور کے ہونٹ میری گردن، سینہ، رخسار، ماتھا، منہ، پیٹ اور رانوں کو چوم رہے تھے۔ اور مجھ پر گویا، پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور دل کہتا تھا کہ یہ لمحات کبھی ختم نہ ہوں۔ اس وقت دنیا بے انتہا خوبصورت ہو گئی تھی۔ نظاروں میں دلربائی اور حسن پیدا ہو گیا تھا۔ وادیاں خواب آلود ہو گئی تھیں۔

بے تاب چشموں کی روانی میں تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ ادھر ادھر سرمئی گیتوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ پہاڑوں پر شباب آگیا تھا۔ ہوا میں عطر کی مہک پھیل گئی تھی۔ جنگلی پھولوں کا حسن اور زیادہ نکھر گیا تھا۔

رات کو جب میں گھر واپس جا رہی تھی، تو میرا ذہن گناہ کے احساس کے بوجھ سے بوجھل ہو رہا تھا اور میری روح مجھے اذیت پہنچا رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب منصور سے زندگی بھر پھر کبھی ملاقات نہیں کروں گی۔ کیوں کہ اسے مجھ سے کوئی محبت نہیں۔ وہ محض مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔

میں اس پر نفرین بھیجتی ہوئی گھر واپس آگئی۔

رات بھر گناہ کا احساس میری روح کو کچوکے دیتا رہا اور مجھے نیند نہ آئی۔ صبح ہوئی تو سارے ڈراونے خیالات کہیں غائب ہو چکے تھے۔

دوسرے روز پھر منصور سے ملاقات ہوئی اور پھر میں اس سے ملنے اس کے کاٹج میں چلی گئی۔ پھر وہی کھیل شروع ہوا اور میں گناہ کا بوجھ لیے گھر واپس آگئی۔

ایک ماہ منصور وہاں رہا اور میں ہر روز رات کو منصور سے چھپ چھپ کر ملتی رہی۔

آخر گناہ رنگ لایا اور مجھے حمل ٹھہر گیا۔ میں کانپ اٹھی لرز گئی۔ کانوں میں عجیب قسم کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ دل ڈوبنے لگا۔ میں نے منصور سے جا کر کہا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"گھبراتی کیوں ہو؟ ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ فکر نہ کرو میں اس کا پورا بندوبست کر دوں گا۔"

"تم کیا کرو گے؟ خدا کے لیے جو کچھ کرنا ہے۔ جلدی کرو منصور ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گی۔"

"مطمئن رہو۔ میں کل ہی شہر جا کر وہاں سے ایک دوائی ہے وہ لاتا ہوں۔ وہ دوائی پینے سے سارا معاملہ ایک ہی دن میں صاف ہو جاتا ہے۔ میرے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس

وہ دوائی ہے۔ بڑی خاص چیز ہے۔ وہ کسی کو نہیں دیتا۔

"پھر جلدی سے وہ دوائی لے آؤ۔ خدا کے لیے جلدی کرو"

"فکر نہ کرو۔ میں کل ضرور چلا جاؤں گا۔ اور پرسوں دوائی لے کر واپس آجاؤں گا۔"

میں مطمئن ہو گئی۔ میں ابھی اتنی بھولی تھی کہ مردوں کی باتوں پر اعتبار کر لیا کرتی تھی۔ منصور نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ بڑا پیار کیا اور پھر وہی کھیل شروع کر دیا۔ میں اسے کچھ نہ کہہ سکی، کیوں کہ جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا تھا۔ اب دور ہٹنے سے کیا فائدہ!

"سچ کہتے ہو ناں کہ تم کل شہر جا کر وہ دوائی لے آؤ گے؟

"اور تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں، اری پگلی میں کل ضرور جا رہا ہوں۔

منصور نے اس روز جی بھر کر میرے جسم سے اپنی ہوس کی پیاس بجھائی۔ اور جب تھک کر چور ہو گیا تو بستر پر اوندھے منہ پڑ گیا۔ میں نے کہا۔

"اب میں جاتی ہوں۔ میں صبح تمہیں بس سٹاپ پر جاتے ہوئے دیکھوں گی۔ پھر میری تسلی ہو گی۔ خدا کے لیے شہر میں زیادہ دیر مت لگانا نہیں تو میں خودکشی کر لوں گی۔

"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں پرسوں آیا۔ سمجھو کل کا دن ہی تو بیچ میں ہے"

دوسرے روز میں بس کے اڈے پر دور جاکر کھڑی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ واقعی منصور وہاں پہنچ گیا۔ مگر اس کا سارا سامان اس کے ساتھ تھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ پھر میں نے سوچا۔

ہو سکتا ہے وہ سامان ساتھ ہی لے جانا چاہتا ہو۔

میرے وہم و گمان میں بھی کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔

منصور نے بھی مجھے دور سے دیکھا۔ ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہی اور بس میں سوار ہو کر پیچھے اتر گیا۔

. . . .

اب میں نے بے قراری سے اس کا انتظار شروع کر دیا۔ وہ دن گذر گیا۔ دوسرا روز طلوع ہوا۔ اس کی شام ہو گئی، رات ہو گئی۔ تیسرا دن آگیا۔ پھر چوتھا روز بھی گذر گیا۔ لیکن منصور نہ آیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں کے گرد گہرا اندھیرا چھا گیا۔ اب کیا ہوگا۔؟

اگر منصور نہ آیا تو کیا ہو گا؟

میں کہاں جاؤں گی؟

کس کو جا کر اپنا دکھڑا سناؤں گی؟

کس سے فریاد کروں گی؟

کون میری دادرسی کرے گا؟

دنیا تو وحشی درندوں سے بھری ہوئی ہے۔ مجھے بخار ہو گیا۔

ایک ڈاکٹر میرا علاج کرنے آیا۔ گول مٹول بیوقوف سا کم گو قسم کا آدمی تھا۔ چہرے پر احمقانہ جھجک تھی اور بڑی ریاکاری سے مسکراتا تھا۔

میری نبض دیکھ کر میری طرف منہ کر کے مسکرایا۔ پھر تنہائی میں مجھ پر جھک کر بولا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہاری تکلیف میں دور کر دوں گا۔ تم کل یا پرسوں کسی وقت میری دوکان پر آنا۔"

میں اس کی بات پر حیران رہ گئی۔ میں نے سوچا آخر ڈاکٹر ہے۔ اور ڈاکٹر بڑے نیک لوگ ہوتے ہیں۔ یہ شخص میرے درد کا ضرور مداوا کر دے گا اور مجھے اور میرے خاندان کو تباہی سے بچا دے گا۔ تیسرے روز بخار اترا تو میں شال اوڑھ کر ڈاکٹر کی دوکان کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس کی دوکان پہاڑ پر نیچے کی جانب ایک ندی کے کنارے واقع تھی۔ ڈاکٹر اس وقت ایک بچے کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر مسکرایا۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اندر عورتوں کے حصے میں جانے کو کہا۔

اس کمرے میں اور کوئی عورت نہیں تھی۔ باہر سے کمپوڈر کے

شبنشیاں ادھر ادھر کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں چپکے سے ایک بنچ پہ بیٹھ گئی ۔۔

۹

میرا دل منصور کی بے وفائی اور اپنی مصیبت کے خیال سے بے حد پریشان ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر اندر آ گیا۔ وہ بڑی مروت سے میرے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اور میرے شانے پر بڑی بے تکلفی سے ہاتھ رکھکر بولا۔

"کون تھا وہ آدمی؟"

شرم سے میں پانی پانی ہو گئی۔ یہ کتنا بد تمیز ڈاکٹر ہے۔ اسے یہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر وہ خود ہی بولا۔

"خیر کوئی بھی ہو۔ کام اس نے ٹھیک نہیں کیا۔
بہرحال آج کل ایسے کیس عام ہو رہے ہیں۔ سارا زمانہ ایسا کر رہا ہے۔ اگر تم نے کر دیا تو کون سی آفت آ گئی ہے"

میں نے سماجت سے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب! مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیجئے۔ نہیں تو میں خودکشی کر لوں گی"

ڈاکٹر مسکرایا اور میرے گال پر انگلی پھیر کر بولا۔

"اتنی خوبصورت لڑکی کو کبھی خودکشی نہیں کرنی چاہیئے میں تمہارے لیے سب کچھ کر دوں گا۔ یہ تو ایک منٹ کا کام ہے۔ اتنی بڑی بات ہی نہیں ہے"

ڈاکٹر کے ان الفاظ نے میری جان میں جان ڈال دی۔ کچھ تسلی ہو گئی۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی ڈاکٹر صاحب! مجھ سے ایک بھیانک غلطی سرزد ہو گئی ہے اور میں اپنی غلطی پر از حد نادم ہوں، پشیمان ہوں۔

"ارے پشیمان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ گناہ تو جوانی کا حق ہے۔ ہر جوانی گناہ کرتی ہے۔ اگر تم نے گناہ کر لیا۔

تو کون سی قیامت آگئی۔ "

" میں نے گناہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب اور خدا گناہ کی سزا ضرور دیتا ہے۔ اور میں وہ سزا بھگت رہی ہوں۔

ڈاکٹر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا۔

" گناہوں کی سزا کا قِصّہ بڑا لمبا ہے۔ ہاں یہ کہو کہ میری فیس ادا کر سکو گی؟ "

" آپ کتنی بھی فیس لیں گے میں ادا کر دوں گی۔ اگر مجھے سارے زیور بھی فروخت کرنے پڑے تو میں کر دوں گی۔

ڈاکٹر مسکرایا۔

" اری پگلی میں تیرے زیور کیوں فروخت کروانے لگا۔ میں اتنی زیادہ فیس تم سے لے ہی نہیں سکتا۔ میری فیس تو بڑی معمولی ہو گی۔ "

" پھر بھی، کتنی؟ "

ڈاکٹر نے میرے منہ کے پاس منہ لاکر کہا۔

" صرف پانچ منٹ کی دوستی "

میں ڈاکٹر کا مطلب سمجھ گئی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار دوں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ کیوں کہ مجھے ڈاکٹر سے

کام تھا۔ اور یہی وہ شخص تھا۔ جو میری زندگی کو ایک بہت بڑی آفت سے
نجات دلا سکتا تھا۔

پھر بھی میں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو ایک بے کس لڑکی کی مجبوری سے
ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ذرا بھی خیال نہیں آتا"

ڈاکٹر بدستور مسکرا رہا تھا۔

ورنہ تم بھی تو مجھ سے فائدہ اٹھا رہی ہو اور پھر تمہارا بگڑے گا
بھی کیا۔ میرا دل خوش ہو جائے گا۔ اور تمہارا کام ہو جائے
گا۔

"مجھے آپ کی شرط ہرگز قبول نہیں"

میں اتنا کہہ کر اٹھنے لگی تو ڈاکٹر نے مجھے فوراً بٹھلا دیا۔

"ہاں ہاں۔ کیا کرتی ہو۔ اتنی جلدی ناراض ہو گئیں؟
ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو اس میں تمہارا نقصان کوئی نہیں اور
فائدہ زیادہ ہے۔ بھلا تمہارا ہرج ہی کیا ہو گا۔ کچھ نہیں۔ بہتی
گنگا سے میں بھی ایک چلو بھر لوں گا۔ اور تمہیں اس کی
پوری پوری قیمت دوں گا۔ دراصل ویسے بھی میں کبھی لڑکی
سے جب تک پہلے بے تکلف نہ ہو جاؤں یہ کام کر ہی نہیں سکتا

۔ تم غور کرلو۔ ایک دن دو دن مزید غور کرلو۔

میری دکان کا دروازہ تم پر ہمیشہ کھلا ہے۔

اتنا کہکر ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے شال اوڑھی اور باہر نکل کر مجھے اپنی حالت پر رونا آگیا۔ میں سارا راستہ روتی آئی۔

وہ ذلیل آدمی مجھے اس قابل رحم حالت میں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اور اب جگہ جگہ میری رسوائی ہو رہی تھی۔ کاش! میں سوچ سمجھ سے کام لیتی اپنے جذبات پر قابو رکھتی۔ برے بھلے میں تمیز کر سکتی۔ پھر ایسی بھیانک گھڑی کبھی نہ آتی۔ اور جگہ جگہ میری عزت کا نیلام نہ اٹھتا

رات بھر میں سوچتی رہی۔ ایک دن اور گذر گیا۔ جو دن گذرتا وہ میری پریشانیوں میں اضافہ کر دیتا۔ میرے گناہ کا بوجھ بڑھ جاتا میں پریشان سے پریشان تر ہو گئی۔

مجھے ہر طرف تباہی اور موت ہی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ تیسرے روز میں شام کو ڈاکٹر کے مطب کی طرف روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر وہی ریاکارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ آج اس مسکراہٹ میں فتح مندی کی جھلک بھی تھی۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر چلنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تمام مریضوں کو رخصت کر دیا۔ اور خود اندر میرے

پاس آگیا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔ کیوں کہ تم عقل مند لڑکی ہو۔ دنیا میں ہر آدمی کچھ نہ کچھ دے کر ہی کچھ حاصل کرتا ہے۔

اس میں اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

میں خاموش رہی اور کچھ نہ بولی۔ ڈاکٹر نے اندر سے کمرہ بند کر لیا۔ اور بتی گل کر دی۔ . . . .

پھر اس نے مجھے گود میں اٹھا کر بڑے ٹیبل پر لٹا دیا۔ اور میری شلوار اتار کر پرے رکھدی۔

بس پانچ منٹ کے بعد وہ میرا آپریشن کر رہا تھا۔

آدھ گھنٹے بعد میں وہاں سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چل کر دوکان سے باہر نکل آئی۔ میری مصیبت دور ہو چکی تھی۔ میری مصیبت کی رات کٹ چکی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اور سیدھا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میری ٹانگوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن میں اپنے گھر پہنچ کر ہی آرام کرنا چاہتی تھی۔

کوئی پندرہ بیس روز میں بستر پہ بخار کا بہانہ بنا کر پڑی رہی۔ ایک ماہ کے بعد میں پھر سے بھلی چنگی ہو گئی۔

اب میرے ہونٹوں پر زندگی کی مٹھاس نہیں۔ بلکہ تلخیوں کا ذائقہ بھی تھا۔

اس رات سیاہ پہاڑیوں کے اوپر نکلتا ہوا چاند یوں معلوم ہوا جیسے زنداں میں گھری ہوئی کوئی اداس دوشیزہ !

۱۰

میری جان فریدہ!

تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا۔ مرد کی محبت تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور اور ہوا کے جھونکے سے جلد ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اس پر اعتبار کرنا گویا آگ کے شعلوں سے کھیلنا ہے۔ دوسری طرف عورت محبت کا پیکر ہے۔ اس کا ضمیر ہی محبت سے تیار ہوا ہے۔ وہ صرف محبت کرنے اور محبت کئے جانے کے لیے تخلیق ہوئی ہے۔ یہ مرد کی محبت ہی ہے جو عورت کو زندگی کی کھلی دھوپ اجلی چاندنی اور آزاد ہوا کے جھونکوں سے محروم کر دیتی ہے۔ پھر بھی عورت مرد کے دھوکے کھا کر اپنی آنکھوں

کی گہری افسردگی اور دل کی درد بھری تنہائیوں کے ساتھ زندگی کا ساتھ نبھاتی چلی جاتی ہے۔

شاید تم مجھے کسی حد تک سمجھتی ہو۔ اور جانتی ہو کہ میں نے آج تک کسی کی نگاہوں کو دعوتِ شوق نہیں دی تھی - میں ایک رومانی لڑکی ہوں۔ اور میں نے ہمیشہ کھنڈروں سے، ویرانوں سے، صحراؤں کی وسعتوں سے پہاڑوں کی بلندیوں سے، فضاؤں کے خلاؤں سے اور ستاروں کے انتشارات پیار کیا ہے۔ میں سرتاپا خزاں بن کر رہ گئی ہوں۔ اب میرے سانس کا جلوس مسموم ہوا کا ایک جھونکا ہے۔

میرے دل میں کتنے زخم ہیں۔ جنہیں صرف چھپانے کے لیئے میں ہنستی رہا کرتی ہوں۔ میری محبت ——— ایک سنسان وادی میں کسی اداس نغمہ کی گونج ہے۔ ایک ٹوٹا ہوا ستارہ ہے۔ ایک گرتی ہوئی آبشار ہے - ایک لڑھکتا ہوا پتھر ہے - وہ ایک زخم خوردہ بلبل کی طرح کسی اجڑے ہوئے گلشن میں بیٹھی۔ جیسے لے میں فریاد کرتی رہتی ہے

آہ! یہ کس عورت کے نازک دل پر ان بے حساب غموں کا بوجھ کیوں ڈال دیا گیا ہے؟ کیوں اسے محبت کی قیمت آنسوؤں کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے

زندگی اس کے پاؤں کو چھو کر گذرتی ہے مگر اسے اتنی اجازت نہیں کہ

وہ اس ندی کے میٹھے پانی سے اپنی پیاس بجھا سکے۔ میں جو کبھی اوس کے موتیوں سے سجے ہوئے مناظر سے پیار کرتی تھی - مدھم روشنی میں نیم مدہوش رہگزاروں پر بے فکری سے خراماں رہا کرتی تھی - گاتی ہوئی ندیوں کے ساتھ گایا کرتی تھی اور جھومتے ہوئے وادی کے گیت میرے ہونٹوں سے ہو کر گذرا کرتے تھے - آج میری پلکیں گرم اشکوں سے بوجھل ہو گئی ہیں۔

اگرچہ میں جانتی تھی کہ میری محبت جن راستوں پر مجھے چلا رہی ہے اس کے نیچے گہرے طوفان پوشیدہ ہیں۔ لیکن میں اندھی ہو کر چلتی رہی اور دنیا ہی کے غار میں گر پڑی -

اب تو میں اپنے قلبی سکون کا جنازہ خود اپنے کندھوں پر اٹھائے لیئے پھر رہی ہوں -

جس زہریلے درخت کو میں جڑوں سے اکھاڑ دینا چاہتی ہوں - فریدہ ما تم اس کی شاخوں پر کبھی جھولا ڈالنے کی کوشش نہ کرنا جس سانپ کو میں کچل دینا چاہتی ہوں - تم اسے آستین میں کبھی نہ رکھنا -

سوچتی ہوں جب بڑھاپے کے قدموں کی خوفناک چاپ سنونگی - تو کیا ہوگا ! جو لڑکیاں جذبات کے دھارے میں بہہ کر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہیں - ان کا یہی انجام ہوتا ہے -

عورت کی محبت کتنی گہری ہوتی ہے - مرد اسے کبھی نہیں سمجھ سکتا - مرد

تو صرف کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ نئے نئے کھلونے چاہتا ہے۔ اور وہ جب نیا کھلونا پاتا ہے۔ تو پہلے کھلونے کو توڑ دیتا ہے۔ مگر عورت کبھی نہیں بھولتی۔ عورت اپنی محبت کو کبھی نہیں بھولتی۔ وہ ہمیشہ پاکیزہ محبت کی بھوکی رہتی ہے۔ وہ کسی کو اپنی بے چین روح کا شریک نہیں بنا سکتی ماضی کی تلخ یادیں اور ناکامی کا احساس اس کے دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا ہے۔

اور جب اس کے دل میں جستجو کی تڑپ اپنی حد سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور اسے کوئی دل کا ساتھی نہیں ملتا، تو وہ موت کے دامن میں جاکر سو جاتی ہے۔

ایسی باتیں میرے دل میں ماضی کی خوابیدہ یادوں کو بیدار کر دیتی ہیں۔ میرے ایام حیات کھلے ہوئے پھولوں کی طرح شگفتہ تھے۔ یہاں میں زندگی کے ایام ایک پریشان خواب کی طرح بسر کر رہی ہوں۔ کہ شاید جاگنے پر میری گم شدہ محبت اور مسرت کے گمنام جزیرے مجھے واپس مل جائیں۔ میرا سینہ جو کبھی نے اپنی محبت کی پاکیزہ کرنوں سے منور کر دیا تھا۔ اب سنہری روشنی کے گل ہو جانے سے تاریک تر ہو رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے لیل و نہار کا یہ حیرت ناک انجام ہوگا۔ اب آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اظہار سے پہلے ہی خاک میں مل جاتی ہیں

خیالات ذہن کو محشرستان بنا تے ہیں اور اپنی موت آپ ہی مرجاتے ہیں۔"

میری حالت اس پرسکون سمندر کی سی ہے۔ جو بظاہر بڑا پرسکون ہو لیکن جس کی تہہ کے نیچے بڑے بڑے بھیانک طوفان گردش کر رہے ہوں۔ دل جب محبت کی ناکامیوں سے چور ہو جاتا ہے۔ تو اس میں پاکیزگی کا پھول اپنے آپ کھل اٹھتا ہے۔ میں بھی اسی پھول کے انتظار میں ہوں۔

اس پھول کی مہک میرے ذہن کو تمام تفکرات سے آزاد کردے گی۔ اور میں ایک بار پھر مسرت آگیں خوابوں میں غرق ہو کر زندگی کی کلفتوں کو فراموش کر دوں گی۔

میرے تاریک مطلعٔ حیات پر اس پھول کا خیال آفتاب بن کر طلوع ہونے والا ہے۔ یہی میرے محبوب خوابوں کی حسین تعبیر ہوگی۔ یہی وہ عظیم الشان طاقت ہوگی۔ جو پس پردہ رہ کر ہماری امیدوں، تقدیروں اور ارادوں کو شیرخوار بچے کے کھلونے کی طرح چشم زدن میں توڑ کر فنا کر دیتی ہے۔

اور مشرق کی عورت تو اپنے شوہر کی الفت اور خدمت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ مگر مجھ سے میرا یہ حق بھی چھین لیا گیا ہے۔

میں نے شادی نہیں کی۔ اور کروں بھی کیسے؟ گوہر عصمت سے دامن خالی ہو تو شادی ایک دوزخ بن جاتی ہے۔ میں اس جہنم سے نکل کر ایک دوسرے جہنم میں نہیں جانا چاہتی۔ ہو سکتا ہے دوسرا جہنم مجھے راس نہ آئے اور اس اپنے جہنم سے میں کافی مانوس ہو گئی ہوں۔

میں اکثر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے خدوخال کا تجزیہ کرتی ہوں۔ اور اپنے اندر ان نقوش کی جستجو کرتی ہوں جو کسی کو گرویدہ کر سکتے ہوں۔

اور مجھے اکثر ناامیدی ہوتی ہے۔ شاید میں اس منزل سے آگے نکل چکی ہوں۔ وہ پیار کی گھڑیاں — وہ ہماری باہمی محبت کی سنہری لڑیاں —— وہ ہار —— وہ بیش قیمت موتی۔ ہیرے — پکھراج — نیلم — سب کے سب۔ مٹی میں مل گئے ہیں۔

گزری ہوئی زندگی کے ایام بھوت بن کر میدانوں میں خاک اڑا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے ایک لمحہ میں ہی وہ اپنے تیز تیز لمبے ناخنوں سے میرا جسم نوچ لیں گے۔ میں ماضی کی بھولی بسری یادوں میں چونک کر اٹھ بیٹھتی ہوں۔

ہر طرف کھلے ہوئے پھول ہیں۔
مسلی ہوئی کلیاں ہیں!
بہار آئی ہے اور آتی رہے گی۔
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

ہ

۱۱

پیاری نیلوفر!

تمہاری درد انگیز داستان پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ساری رات تمہارے غم کے خیال سے خود بھی غمگین رہی۔ کاش! تم اس ذلیل انسان سے کبھی نہ ملتیں اور اگر ملی ہی تھیں تو اس کمینے کی میٹھی میٹھی باتوں پر کبھی اعتبار نہ کرتیں۔ وہ ایک جھوٹا اور مکار انسان تھا۔ جو تم سے دھوکہ کر کے راہِ فرار اختیار کر گیا۔

میری پیاری سہیلی! مرد شہزادہ ہو یا بھکاری۔ مکاری و عیاری

اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مرد کی محبت بڑی جلدی بدل جانے والی چیز ہوتی ہے۔ دھوپ کے سائے کی طرح ابھی یہاں ہے۔ تو ایک منٹ کے بعد کسی دوسری جگہ ہو گی۔ وہ بھونرے کی طرح ہر کلی کا رس چوستا ہے۔ اور پھر اسے مرجھایا ہوا چھوڑ کر اڑ جاتا ہے۔

اور کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔

وہ کسی بھی پھول کے ساتھ خاک ہو جانا نہیں جانتا۔ مرد کی محبت صحرا کے سینے پر قدم کا وہ نشان ہے۔ جسے مٹانا یا جس کا مٹ جانا معمولی سی بات ہے۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی اسے بالکل بے نشان کر سکتا ہے۔

میری پیاری سیلو!

جس محبت کو مرد پیش کرتا ہے۔ میں اس کی قائل نہیں ہوں۔ اس کی محبت ہے کیا، رات بسر کرنے کا رنگین شغل۔ یہ محبت کے دعوے دار ہوتے ہیں۔ اپنی آہوں، آنسوؤں اور میٹھی میٹھی چکنی چکنی باتوں سے بھولی عورت کے دل کو پھانس لیتے ہیں۔ مردوں کا جوش شباب جب اس منتقل تک دوڑ سے اور گرم روی سے سرد پڑ جاتا ہے جب انبساط و طرب کی بازی گاہ میں کھیلنے اور برابر کھیلتے رہنے سے

اس کی خواہشات کے ساتھ ساتھ اس کے اعضا بھی کمزور ہو جاتے ہیں تو وہ عورت سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

پیاری نیلو!

مرد جو کچھ منہ سے کہتا ہے۔ اس پر کبھی عمل نہیں کرتا ہے۔ سبز باغ دکھا کر عورت کے دل کو موم کر لیتا ہے۔ پھر اس پر تشدد کرتا ہے اور محبت کے بدلے اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

یہ مرد بڑا ہی خطرناک جانور ہے۔ اس سے حتی الامکان بچنا ہی چاہیئے۔ اس کے پھندے میں کبھی نہیں پھنسنا چاہیئے۔ ورنہ زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ ساری زندگی کا غم گلے میں پڑ جاتا ہے۔ پھر عورت اس دنیا میں کبھی سکھ کا سانس نہیں لے سکتی۔ تم اپنی حالت ہی دیکھ لو۔ کتنی خوش فکر۔ خوش ادا اور بے فکر ہوا کرتی تھیں۔ اور آج۔ کتنی رنجیدہ اور اداس ہو۔ آخر کس وجہ سے۔ محض ایک مرد کی کمینگی کی وجہ سے۔

مرد کے ساتھ محبت کرنے سے تو بہتر ہے کہ عورت زہر کھا کر خود کشی کر لے۔ کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔

آگ میں جل کر بھسم ہو جائے۔

لیکن مرد کا فریب کبھی نہ کھائے۔ میرے دل پر بھی اس دھوکے

کا ایک گہرا زخم لگا ہے۔ تمہیں پھر کبھی بتا دوں گی۔ میری حالت بھی تمہاری حالت سے کبھی کم نہیں ہوا کرتی تھی۔ لیکن خدا نے مجھ کو صبر دے دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ضرور صبر کی نعمت عطا کرے گا۔ فکر نہ کرو۔

محبت تو ایک انتہائی پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایک انتہائی بلند اور معطر ہوا ہے۔ لیکن مرد کی محبت۔ یا اس دنیا کی محبت ایک معمہ ہے ایک الجھن ہے ایک نہایت ہی شیریں فریب ہے۔ تم بھولی بھالی تھیں۔ جو اس کے فریب میں آگئیں۔ صحرا کی شدت حرارت سے پانی کو ریت میں تبدیل ہوتے تم نے نہیں دیکھا۔ نیلوفر! میرے خیال میں تو چشمہ سراب کی جستجو میں تشنہ کام مرجانا ہی بہتر ہے۔ محبت ایک حسین دھوکا ہے۔ ایک نہایت ہی شیریں فریب ہے بہت ہی پر فریب خواب ہے۔ ایک پر پیچ الجھن ہے جسے عورت کی عقل کبھی نہیں سلجھا سکتی اور مرد کی ہوس اسے اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔

تم بڑی رومانوی لڑکی ہو۔ تمہارے ساتھ اس ذلیل انسان نے بڑا ظلم کیا ہے۔ تم تو حسن پرست لڑکی تھیں۔ تم نے تو شفق کی سرخیوں میں شبنم کے موتیوں میں موتیوں کی چمک دمک

ہیں ستاروں کی چمک ہیں، بارش کے چھینٹوں ہیں دھنک کی رنگین قوس ہیں کہکشاں کی جھلملاتی افشاں ہیں بجلی کی تڑپ ہیں کوئل کی کوک میں طاؤس کے رقص ہیں آہو کی پائل ہیں، پائل کی جھنکار ہیں ہواؤں کے ترنم ہیں اور آبشاروں کی گنگناہٹوں ہیں حسن کو تلاش کیا ہے اور تم نے پا بھی لیا ہے۔

میں جانتی ہوں کہ جب کالج کے ہوسٹل ہیں ہم دونوں اکٹھی رہا کرتی تھیں۔ تو تم نے چاندنی رات ہیں چھت پر جاکر ٹہلا کرتی تھیں۔ جب سارے ہنگامے سو جایا کرتے تھے۔ اور خاموشیاں بیدار ہو جاتی تھیں۔ جب چاند آسمان کی نیلی کھڑکی سے باہر جھانکتا تھا۔ جب پھولوں کو خواب آنے لگتے تھے۔ جب ٹھٹھرتی ہوئی رات گرم ستاروں بھری شال اوڑھ لیتی تھی۔ تو تم کمرے سے باہر نکل کر چھت پر جاکر چاند کو دیکھا کرتی تھیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ تم شمع محبت اور حسن ہو۔ تم شفق سے زیادہ رنگین، نرگس سے زیادہ معطر اور نغمے سے زیادہ طرب انگیز ہو۔ میں بھی تم سے بے حد پیار کرتی ہوں۔

بارش کا پہلا چھینٹا سوکھے ہوئے درختوں کے لیے بہار پرندوں کیلئے اور منزل تھکے ماندے مسافر کے لیے اتنی باعث مسرت نہیں جتنا کہ تمہارا وجود میرے لیے ہے۔

کبھی کبھی تو میں تمہارے بہت ہی قریب ہوتی ہوں۔ بہت قریب جلتی ہوئی شمع کے قریب پروانے۔

ندی کے پرسکون سینہ پر کھلے ہوئے کنول!

میری تنہائیوں میں تمہارے نقرئی قہقہے ابھی تک گونج رہے ہیں۔

نیلوفر! زندگی میں انسان کے ساتھ کبھی نہ کبھی ایسا واقعہ بھی ہو گذرتا ہے۔ جسے انسان سینے کی عمیق گہرائی میں دفن کر لیتا ہے۔ اور اس کی باقی ماندہ زندگی کے نشیب فراز کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کسک سے بھی اسے بے چین رکھتا ہے۔

تمہارے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ لیکن وقت کا سمندر اس تلخ تجربے کے نقوش کو ضرور دھو ڈالے گا۔ اور تمہارا ذہن ایک بار پھر کنول کے پھول کی طرح ہلکا پھلکا اور پاکیزہ ہو جائے گا۔

انسان کو علم نہیں ہوتا کہ وہ جسے پھول سمجھ کر دامن میں سمیٹ لے ہے۔ وہی خار بن کر اس کے دامن کو تار تار کر دے گا۔ یہ انسان کی بھول ہوتی ہے۔ اور بھول ہر انسان سے ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن انشاءاللہ تمہاری رسوائیوں کے داغ دھل جائیں گے اور ماضی کے داغ مستقبل کے چراغ بن کر جگمگا اٹھیں گے۔ دل گرمیوں کی چاندنی رات میں سوئی ہوئی جھیل کی طرح پرسکون ہو جائے گا۔ ہاں کبھی کبھی پرانی تلخ یادوں کا ایک

ہلکا سا جھونکا اس میں تھوڑا سا تموج پیدا کر دیا کرے گا۔

اور ایک وقت آئے گا۔ کہ یہ تموج بھی باقی نہ رہے گا۔ اور تم مکمل سکون سے ہمکنار ہو جاؤ گی۔ اور صبح کا سورج بھیانک رات کے روشندان میں سے اپنی پہلی اور سنہری کرن کو تمہارے خیر مقدم کے لیے بھیجے گا۔ ماضی اور حال کی تلخ حدود کو پرے ہٹا کر تم مستقبل کے خوشں آئینڈ خواب دیکھا کرو۔"

تم پانی کا وہ تالاب بن جاؤ۔ جو باہر سے اتنا گہرا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن تیرنے والا اس کی گہرائی میں گم ہو کر رہ جائے۔ تمہاری آنکھوں میں سمندر کی گہرائی ہو چاندی کے کٹوروں میں پڑے ہوئے شفاف پانی کی پاکیزہ جھیل ہو۔ وہ ندی بن جاؤ جو بڑے بڑے پتھروں کے گرنے سے بھی اپنی روانی کو نہیں روکتی اور برابر بہے چلی جاتی ہے۔ باقی پھر لکھوں گی۔

تمہاری

فریدہ

O

۱۲

سردی تیر کی طرح جسم میں پیوست ہو رہی تھی۔

سرد آنسوؤں کی طرح گیلے دن۔ نمناک راتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس سر جھکائے رات کی تاریکی میں سو رہی ہو۔ سورج سنہری کرنوں سے شفق کی پیشانی پر اپنے الوداعی بوسے کا آخری نشان چھوڑ کر کب کا رخصت ہو چکا ہے۔ اس غمگین سرد تنہائی میں ایک اداس نغمہ گونج اٹھا۔ جیسے بہتی ہوئی ندی میں کوئی خشک پتہ آکر گر پڑے۔

چاندی کی نقرئی موجیں خاموش فضا میں لہرا رہی تھیں۔ ہوا کے

ٹھنڈے جھونکے دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ خواب کا ہلکا ہلکا
پھیکا پھیکا رنگ وسعت کائنات پر پھیل رہا تھا۔

میرے دل پر یادوں کے لشکر نے حملہ کر دیا تھا۔ میرے خیالات
شکستہ جہاز کی طرح سمندر کی لہروں پر ڈول رہے تھے۔ اور دل پر بوجھ
سا چھا رہا تھا۔

کبھی میری دنیا رنگین خوابوں کی بستی تھی۔ اس میں تصورات
کے سنہری محل کھڑے تھے۔ تمناؤں کا ہجوم تھا۔ اور اب یاس و
ناامیدی کے ویران کھنڈر ہیں۔ رنگین خواب بکھر گئے ہیں۔ تصورات
کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ آہ! کیا خبر تھی کہ یہ مسرت سے بھرپور لمحات
سردیوں کی دھوپ اور بادلوں کی چھاؤں ہیں۔"

- - - - - - - - - - - - - -

آج کی صبح بادلوں کے پردوں میں سے کائنات کو جھانک رہی ہے
آندھی نے موسم کو نہایت وحشت ناک بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہواؤں کی تیز
سرسراہٹ ایسی سنائی دیتی ہے۔ جیسے ہزاروں دکھی روحیں بین کر
رہی ہوں۔

زندگی! سو کر اٹھے ہوئے مزدور کی طرح ملول و پژمردہ ہے
آہ! میرے خدا! یہ کیسی المناک صبح ہے ——— ماضی!۔

عیش و نشاط کے دنوں کی دلچسپ مگر الم انگیز یادیں - میرے شیشۂ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہیں -

کاش میں نفرت کر سکتی - اپنی زندگی سے نفرت ہی کر سکتی اور خودکشی کر لیتی - مگر مجھے زندہ رہنے سے پیار ہے - اور میں مرتے دم تک پوری سرگرمی اور جوش و خروش سے زندہ رہنا چاہتی ہوں -

اس بدکردار شخص نے مجھے بیکس اور بے سہارا - ایسی حالت میں چھوڑ دیا ہے - جب میرے ہاتھوں میں سکت نہیں - میرے چاروں طرف بھیانک تاریکی چھائی ہوئی ہے - میری قوت گویائی سلب ہو چکی ہے - زندگی کی چاندنی راتیں مکڑی کے جالے کی طرح الجھ کر رہ گئی ہیں - وہ گلزار میں آباد ہے لیکن میرے لیے ایک ویران صحرا کے سوا اور کچھ نہیں! صحرا! جہاں گرم گرم بگولے اٹھتے ہیں -

جہاں میں دیوانہ وار چلاتی ہوں - مگر میری فریاد سننے والا کوئی نہیں درد سے تڑپتی ہوں تو کوئی سہارا دینے والا نہیں ہے - کوئی ہم نوا نہیں کوئی ہم سفر نہیں کوئی ہم درد نہیں - میں ہوں اور میری ناکام زندگی ہے -

. . . .

محبت کی آگ جو برابر دل کی گہرائیوں میں سلگ رہی ہے - سلگتی رہے

گی اور رات کے اندھیرے میں آنسوؤں کی بارش سے کچھ لمحات کے لیے عارضی طور پر سرد پڑ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آہوں کی ہوا سے پھر آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

شب کی تاریکی میں دُور آسمان پر ایک درخشندہ ستارہ اس طرح چمک رہا ہے۔ جیسے ایک آنسو ہے جو آسمان کی پلکوں پر اٹک گیا ہے ایک ستارہ ــ ایک آنسو ــــ ایک دل ــــ فرطِ الم سے کانپتا ہوا دل!!

میری گمشدہ محبت کی جنت تباہ ہوکر رہ گئی۔ میری بربادی! لوگوں کے طعنے۔ ان کی خاموشی بھی مجھ کو طعنہ زن معلوم ہوتی ہے۔

میری نبض ایسے لمحات میں میرے ارمانوں کی طرح دھڑکنے لگتی ہے۔ ویرانے سے سہمی ہوئی۔ گھبرائی ہوئی ایک بے کس عورت سنسان جنگل میں چلی جا رہی ہے۔

کاش کسی کو بھی معلوم ہو جائے کہ عورت کے پہلو میں بھی ایک دل ہوتا ہے۔ نازک اور حساس دل جو نگاہ کی گرمی سے پگھل جاتا ہے اور زبان کی ذرا سی جنبش سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ دنیا میں سب سے نازک اور نرم چیز عورت کا دل ہے اور اتنی نازک چیز اتنے وحشی مرد کے ہاتھوں میں دے دی جاتی ہے۔ اور اسے پوری آزادی ہوتی

ہے کہ جب چاہے اسے توڑ کر رکھ دے ۔ عورت ایک ہی نگاہ سے ماضی اور مستقبل دونوں کو دیکھ لیتی ہے ۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی بن جایا کرتی ہے ۔ اور کان رکھتے ہوتے بھی بہرہ بن جایا کرتی ہے ۔

عورتیں اس لیے جاہل ہیں کہ انہیں آزادی نصیب نہیں ۔

ماضی کی یادیں میرے لیے خواب و خیال بننے والی ہیں حال میں سوائے انتشار کے اور کچھ نہیں ۔ اور مستقبل میں امید کی ایک کرن بھی نہیں دکھائی دے رہی ۔ اس صورت حال نے مجھے پریشان کر دیا ہے ۔

غم و مسرت کا یہ طلسمی نظام کہ مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کی قطار در قطار موجود ہیں ۔ بہار کا دامن خزاں سے بندھا ہوا ہے ۔ شگفتگی کی روح میں پژمردگی کے جراثیم اور زندگی کے دل میں موت کا کانٹا چھپا ہوا ہے نہ خوشی ہمیشہ کی ہے اور نہ غم ہی کو دوام ہے ۔

۱۳

کس قدر موسلادھار بارش ہو رہی ہے۔

ہوا کے جھونکے درختوں کو جھولا جھلا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بارش اور تیز ہوا کبھی نہیں تھمے گی۔ انگور کی بیل ابھی تک شکستہ دیوار کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔

زندگی میں بھی اسی طرح بھیگے ہوئے سرد بھیانک موسم آتے ہیں۔ اور پھر گذر جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بارش بھی گذر جائے گی۔ اس کے باوجود روح افسردہ ہے۔ اور دل غمگین ہے۔ بادلوں کے ان آنسوؤں سے داغ دل دھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ ،،

جب داغ نہیں دھاتا تو بچوں کی طرح روتی ہوں۔ دل کے ارباب کے ایک ایک تار میں سوزِ غم سرائت کر چکا ہے۔ پاکیزہ محبت میں جادو کا اثر ہوتا ہے۔ چند گھنٹوں کی سچی محبت ۔ ایک عمر کی جھوٹی اور دغاباز محبت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ زندگی میں کسی کے دل کی حالت جانچنے کے بہت کم مواقع پیش آتے ہیں۔ اور ان امتحانوں میں بڑے۔ بڑوں کی قلعی کھل جاتی ہے۔

آزمائش کی آگ میں کھرا کھوٹا الگ ہو جاتا ہے۔

رات ایک ڈراؤنا خواب بن کر مجھے چاروں طرف سے آن کر گھیر لیتی ہے۔ تاریکی چاروں طرف سے میرا خیر مقدم کرتی ہے۔ اور ایک وحشت سی دل میں گشت کرنے لگتی ہے۔ اور زندگی کی تمام ہونی کی صورتیں میرے دل کے آئینہ خانے میں سجی ہوئی ہیں۔ سکول اور کالج میں بسر کئے ہوئے دنوں کی یاد۔ اپنے دل اور دماغ میں کروٹیں لیتے ہیں۔ وہی پیار۔ وہ دن، وہ ادب کتابیں، پھول سبزہ، ابتدائی زندگی، کے خوش آئند منصوبے۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے کہ آدھی زندگی خواہشات کرتے اور آدھی ان کی تکمیل کے انتظار میں گذار دے!

آخر بارش رک گئی۔ آفتاب ایوانِ مشرق سے مسکراتا ہوا

نکلا۔ اور خراماں خراماں منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ روشنی اور تاریکی چھٹ گئی۔

دنیا نور و ضیا سے جگمگا اٹھی ہے۔

میری کھڑکی سے باہر پر سکون ندی ہلکے اور میٹھے سروں میں گاتی چلی جا رہی ہے۔ ننھی ننھی پیاری پیاری چڑیاں بہار کے گیت گا رہی ہیں۔ ان کی میٹھی اور سریلی آوازدلوں میں تڑپ پیدا کر رہی ہے۔ تڑپ اور امنگ اور نیا ولولہ سرسبز کے لہلہاتے ہوئے کھیت۔ سنہری دھوپ میں جاگ پڑے۔ گھاس پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح چمک اٹھے ہیں۔ جوش اور امنگ سے بھرپور دل لیے کسان کھیتوں میں کام کرنے نکل آئے ہیں۔ مویشی اور بھیڑیں دلہنوں کی طرح سر جھکائے سرسبز چراگاہوں میں اِدھر اُدھر چوکڑی بھر رہی ہیں۔ مرغان سحر ترنم ریز ہیں۔

رات کو جب چاند نکلے گا۔ تو عجیب انداز سے طلوع ہوگا چھپ چھپ کر شرما شرما کر جیسے کوئی نئی نویلی دلہن آنکھیں کھول کھول کر بار بار جھپکائے۔

یہ چاند گہرے بادلوں میں بار بار چھپ جائے گا۔ آنکھیں یہ منظر دیکھکر اپنے آپ مسکرا اٹھتی ہیں۔ چاند لوگوں کی نگاہوں

کا مرکز ہے۔

ہوس کی آگ بجھ جاتی ہے۔ مگر محبت کی آگ کبھی سرد نہیں ہوتی لیکن میری زندگی میں شاید اب ایسا چاند کبھی طلوع نہ ہو جب مشرق سے لے کر مغرب تک اپنے پورے سفر میں ایک بار بھی بادلوں میں نہ چھپے۔ میری تمنائیں اور آرزوئیں زندگی کے بوجھ تلے دب کر رہ جائیں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میں خاموشی سے سر جھکاتے رہوں اور شہنائیوں کی دلربا گونج میں اپنی امنگوں کا سہاگ اجڑتے دیکھتی رہوں۔

لیکن میں اگر چاہوں بھی تو کیا کر سکتی ہوں؟ میرا خیال ہے کہ پاکستانی یا ہندوستانی لڑکی سے زیادہ بے بس مخلوق اس پوری دنیا اور کوئی نہیں ہے۔ جس کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیں۔ وہ اسی کے ساتھ چلی جائے گی۔ اگر چاہے وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے۔ لیکن وہی شخص اس کی امیدوں کا مرکز اور اس کے جذبات اور خواہشات کا محور ہو گا۔

یہ سزا چار دیواری میں بند ایک بے کس دبے نوا لڑکی کو ملتی ہے جسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے! شاید آنے والی پر مسرت زندگی کے حسین خواب بکھیر رہی ہوتی ہے۔ میں اپنے مچلتے ہوئے ارمانوں کے سینے پر پتھر کی سل رکھ دوں گی۔ میں بھی پاکستانی لڑکی ہوں۔ میری

آئندہ زندگی میرے بس میں نہیں۔ میں انتہائی ناامیدی کے عالم میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گی۔ اور اپنے ماں باپ کے لیے بدنامی کا باعث نہیں بنوں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اگر تم غمگین ہو تو ساری دنیا تمہیں افسردہ نظر آئے گی۔ اور اگر تم خوش ہو تو ہر طرف تمہیں خوشی ہی خوشی نظر آئے گی۔

جب اسی کوٹھی کے لان میں جہاں میں اس وقت اپنی کھڑکی کے ساتھ لگی کھڑی باہر دیکھ رہی ہوں۔ خزاں کا موسم آئے گا۔ تو ویران ہوائیں چلنا شروع ہو جائیں گی۔ اور ہوا کے جھونکے پر انگور کی بیل کے زرد پتے گر کر فنا ہو جایا کریں گے۔ ان پتوں کا رنگ زرد ہو گا وہ گویا پہلے ہی سے گرنے کو تیار ہوں گے۔ انہوں نے قدرت کے فنا کے اصول کو پہلے ہی سے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہو گا۔ اور جب ادھر کا اشارہ ہو گا تو فوراً سر تسلیم خم کر دیں گے۔ بقول غالب

؎ کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے۔

یہ پتے زمین پر پڑے پڑے اپنی شاخوں کو حسرت بھری نظروں سے تکا کریں گے۔ اور پھر ہوا کے وہی جھونکے جنہوں نے انہیں انگور کی ٹہنیوں پر سے توڑا تھا۔ یہاں سے بھی اڑا کر جانے کدھر لے جائیں گے۔

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑا!
اب کے بچھڑے کب ملیں گے دور پڑے ہیں جا

پھر بہار کا پہلا سانس اڑے گا۔

بہار اپنا دھانی لباس زیب تن کئے ہوئے ہوا کے خوشبودار جھونکوں کے ساتھ اڑتی ہوئی چمن میں ادھر سے ادھر تک پھیل جائے گی۔ پھر ہلکی بارش ہوگی اور ننھی ننھی بوندیں ایک ساتھ مل کر زمین کو اس قابل بنا دیں گے۔ کہ وہاں پھر نئے سرے سے ننھے ننھے پھول اور شگوفے پھوٹ سکیں۔ حسن کی سوئی ہوئی ساری کائنات جاگ اٹھے گی۔ شام کو آسمان پر روشنیوں کے ان گنت رنگ تبدیل ہوں گے۔ کبھی زرد کبھی سنہری، کبھی نیلا اور کبھی ____________

بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے اڑنے چلے آئیں گے۔ اور وادی میں ان کے سائے پھیل جائیں گے۔ جیسے یہ بادل بھی اپنی منزل کی تلاش میں گھوم پھر رہے ہوں۔

اور ان کی بوندیں ان کے گلوں کی سفید موتیوں کی مالائیں ہوں۔ بوندیں ایک ہی رفتار ایک ہی انداز سے بادلوں میں سے برسنے لگیں گی۔ ان کی دھاروں میں محبت اور نظم و ضبط کا پیام ہوگا۔ تھوڑی دیر میں جب بارش رکے گی تو پھر آسمان پہ دوسرا ہی سماں ہوگا۔

قوس قزح چھین جائے گی۔ رنگ برنگ کے آوارہ ٹکڑے کسی بدنصیب بیوہ کی تقدیر کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہوں گے۔

ہوا کے جھونکوں میں دل کی دنیا اڑ رہی ہوگی۔ ایسے مدہوش منظر کو دیکھتے جاؤ اور دل کبھی نہیں بھرے گا۔ باغوں میں اور ہی کمال ہوگا۔ گویا ہر طرف سبزہ اور ہر بالی کسی حسین شہزادی کے خیر مقدم کی تیاریاں کر رہی ہوگی۔

جنگل کے ہرے بھرے درختوں میں جنت کی جھلکیاں نظر آ رہی ہوں گی رنگ برنگ کے خوشنما پھول اپنی اپنی شاخوں پر کھلے ہوں گے۔ اور خوشبو اڑا رہے ہوں گے۔ اور کہیں زمین پر بکھرے پڑے ہوں گے پھولوں کی نکھری ہوئی رنگت اور ندی کے پانی کی تیز تیز روانی۔ چشمے کے پانیوں کی جان بخش ٹھنڈک۔ ان سب میں ایک صحت مند تازگی ہوگی۔

....

محبت کی بدنامیاں، رسوائیاں اور ناکامیاں ہر شخص کے حصے میں نہیں آتیں۔ لوگ جن رسوائیوں سے ڈرتے ہیں وہی محبت کے افسانے کی بنیاد ہوتی ہیں۔ وہ محبت ہی کیا جو بدنام نہ ہو۔ وہ عشق ہی کیا جس میں ناکامی شریک نہ ہو۔ ناکامی اور رسوائی کے بعد محبت کا سرور دوگنا ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کے تن مردہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ محبت کی

کامیابی ناکامی میں اور سربلندی رسوائی میں ہے۔

تم بھی نیلوفر! محبت میں مسرتوں کے خواب دیکھنے کی کوشش نہ کرو یہ محبت کی توہین اور اس کی بدنامی ہے۔ مسرتیں اور خوشیاں چاہتے ہو تو کہیں کسی کلب گھر کی ممبر بن جاؤ۔ وہاں تمہیں بہت سے چٹخارے مل جائیں گے۔ ہنسی خوشی، قہقہے، کھیل کود، بھاگ دوڑ، اور ایسی بہت سی چسکیاں!

لیکن میں پوچھتی ہوں۔ کہ دنیا میں ان قہقہوں ان مسکراہٹوں کا کوئی وزن بھی ہے؟ یہ فنا ہو جانے والی اور ڈھل جانے والی زندگی کے سطحی چھلکے ہیں۔ یہ بے کیف ہیں۔ یہ چند کٹھ پتلیاں ہیں۔ جو تھوڑی دیر ناچ دکھا کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ جن کی بنیاد کچھ بھی نہیں ہے۔ بس پاکیزہ محبت کی ناکامی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ پاکیزہ محبت ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔ اور کبھی ذہنی کوفت کا باعث نہیں بنتی۔ محبت کی بارگاہ میں صرف زخمی دل اشک ریز آنکھوں کا ہی تحفہ قبول ہوتا ہے سکون و راحت کے تحفوں کو وہاں رد کر دیا جاتا ہے۔

محبت ایک ایسے دل کی متلاشی ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ تڑپتا رہے اور بے چین رہے۔ جو بے باک اور جرات آزما ہو۔ یہ دنیا والے جو سراپا ہوس کے بندے اور دنیاوی خواہشات کے غلام ہیں۔ ہر چیز

کو مسرت اور خوشی کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ یہ اپنے نفس کو چند بے کیف مسکراہٹوں سے دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بزدل اور ڈرپوک ہیں۔ یہ ناکامی کے تصور ہی سے لرز جاتے ہیں اور گاجر مولی کی طرح محبت کا مول تول کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور محبت ہر منزل پر اختیار۔ اور کسی بھی منزل پہ ترک کی جا سکتی ہے۔

دنیا کی کوئی چیز بھی محبت کی قیمت نہیں پا سکتی۔ مسرتیں ناپائیدار ہیں۔ اور محبت کا جذبہ سرمدی اور پائیدار جذبہ ہے۔ ناپائیدار کا پائیدار کے ساتھ کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ تم ہیرے اور کنکر کو ایک ہی ترازو میں تولنے کی کوشش مت کرو۔

ابھرتے ہوئے اجالوں کو دیکھکر یہ نہ سمجھ لو کہ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔

دریا میں اٹھنے والا حباب کشتی کا رخ کبھی نہیں موڑ سکتا۔ پرچھائیوں کے پیچھے اپنا وقت ضائع مت کرو۔ محبت صرف محبت کے لیے ہے یہ میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ اور اس حقیقت میں میرے دل کے لہو کی بوندیں شامل ہیں۔ انسان جب تک اس زندان آب و گل میں گھرا رہتا ہے۔ مسرت اور غم کے متضاد اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

زندگی بذاتِ خود ایک اتفاق ہے۔ یا اتفاق کا دوسرا نام ہے مجھے نہیں معلوم۔

میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ اتفاقات کو اس زندگی میں خاصہ دخل ہے۔ وہ کبھی زندگی کو زندگی اور کبھی اسے مستقل عذاب میں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ جوانی جسے ہیرے کا ٹکڑا سمجھتی تھی۔ بڑھاپے نے جھک کر دیکھا تو وہ شبنم کی ایک بوند تھی۔ اس دنیا میں عورت ایک خوشنما پھول ہے۔ جسے اس کی عطر بیز نکہتوں سے لذت گیر ہونے کے واسطے مرد اسے شاخ سے توڑ کر الگ کر دیتا ہے۔ اور جب دھیرے دھیرے اس میں وہ پہلی سی لذت نہیں رہتی۔ تو اسے فرش خاک پر پھینک دیتا ہے۔

دوسری طرف ہم لوگوں نے شادی کے مفہوم کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ شادی دو روحوں کے پاک رشتے کا نام ہے۔

جس میں بندھ کر دونوں ایک دوسرے میں اپنی علیحدگی کو گم کر دیتے ہیں۔ اور یہ اسی وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ جب یہ دونوں بلحاظ عادات و خصائل کے یکساں ہوں۔ لیکن ہمارے ہاں عموماً اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اگر عورت مشرقی حسن کا نمونہ ہے تو خاوند مغربی رنگ میں رچا ہوا

ہے ۔ اگر خاوند پچاس سالہ بڈھا ہے تو بیوی چودہ سالہ دوشیزہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ۔ معاشرتی اور گھریلو زندگی کی فضا ایک مستقل عذاب بن کر رہ جاتی ہے ۔ اور ایسی آگ اس گھر میں لگتی ہے ۔ کہ جو نہ صرف اس گھر کو ہی تباہ کرتی ہے ۔ بلکہ نزدیک و دور پر اپنی تباہ کاریوں کی دہشت طاری کر دیتی ہے ۔ ۔

....

تم دنیائے محبت کی وہ ہستی ہو ۔ جس کی پرستش کو میں عبادت سمجھتی ہوں ۔ نیلوفر ! تیرے متبسم ہوتے ہی میری روح شگفتہ ہو جاتی ہے ۔ تیری ترنم ریز آواز میرے ساز دل پر مضراب کا کام دیتی ہے اور میری روح نغمات و موسیقی کی لطافتوں میں ڈوب جاتی ہے ۔

۱۴

بہار کا موسم شروع ہو گیا ہے۔

سرخ گلاب کی کیاریوں میں پھول کھل گئے ہیں اور بھونرے راگ گاتے ادھر ادھر چکر لگا رہے ہیں۔ میں یہ سطریں سرخ گلاب کے باغیچے میں نارنگی کے ایک شاداب درخت تلے ٹھنڈے سائے میں بیٹھکر قلم بند کر رہی ہوں۔ میرے چاروں طرف ایک دھاقی موسیقی سانس لیتی سنائی دے رہی ہے۔

ایسے لگتا ہے۔ جیسے مقدس موجیں گلستان خیام میں شعر و نغمہ گا رہی ہیں۔ میرے ارد گرد سینکڑوں رنگین پھول مسکرا رہے ہیں۔

کاسنی اور بنفشی رنگ کے پھولوں پر بہار کے موسم کی اولین سنہری دھوپ چمک رہی ہے۔ نیلے آسمان پر ایک گہرا استقلال برس رہا ہے۔

آہ!— کس قدر دل پذیر ہے یہ وقت! ایک خیال مجھے مغموم کر رہا ہے۔ ایک آرزو میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے کاش تم شاعرہ ہوتیں فریدہ اور میرے جذباتی ہیجان کو پہچان سکتیں اور میری طرح خواب کو زندگی اور زندگی کو ایک خواب سمجھتیں

اب تو میرے لیے ساری دنیا سمٹ کر ایک آرزو بن گئی ہے۔ کسی کا قرب اور انتظار — آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔ جسے میں خود بھی نہیں جانتی۔ اور کان اس کی آواز کو سننے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔ جس کی آواز کو میں بالکل نہیں پہچان سکتی فضا مجھے اس کے سانس کی خوشبو سے مہکی ہوئی اور لطیف تر محسوس ہو رہی ہے۔ رات کو سوتے ہوئے آخری چیز اس کی یاد ہوتی ہے۔ اور صبح بیدار ہوتے ہوئے پہلی چیز اس کا خیال۔

حالانکہ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں اس سے کبھی نہیں ملی۔ میں نے اس کی آواز کبھی نہیں سنی۔

شاید وہ ایک آئیڈل ہے۔ کبھی نہیں ملے گا۔ شاید یہ تصو فطرت

اور حسن کی ساری رعنائیوں کا نچوڑ ہے۔

. . . .

رات کے سناٹے میں جب در و دیوار کے سائے چاندنی میں کانپتے ہیں اور زرد پھولوں کے باغیچے کی آخری روش پر کوئی چھوٹا سا پرندہ اداس صورت بنائے اپنی دھیمی آوازمیں سیٹی بجاتا ہے۔ تو میری روح زندگی کے گذشتہ خوابوں کی تلاش میں اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ وہ رات کے سائے میں زندگی کو تلاش کرتی ہے۔ مگر آہ۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ وہاں صرف ایک سایہ —— تارے کی طرح روشن روح کی طرح مبارک نغمے کی طرح معصوم اور متبرک رہتا ہے۔ اور میری ناکام روح واپس آجاتی ہے پھر جب اداس خوابوں کے سائے زندگی کے راستے پر جلوہ فگن ہوتے ہیں جب یہ راستہ ایک افسردہ روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ تو میری روح پرانے گیتوں کی یادمیں اسی آئیڈل کے پاس پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ خالی سایوں میں ابدی حقائق کو تلاش کرنے کی بے سود کوشش کرتی ہے۔ اور ناکام ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہاں صرف میرے ارمان —— خزاں کے پھولوں کی طرح پژمردہ، بیمار کی کراہ کی طرح اداس۔ برسے موسم کے آسمان کی طرح بے رونق سرنگوں بیٹھے رہتے ہیں۔ ـ

میں اپنے آئیڈیل سے جدا ہوں۔

وہ آئیڈیل جو مجھے آج تک نہیں مل سکا۔ لیکن جس کی تلاش میں موت کے بعد بھی جاری رکھوں گی۔ شاید مجھے اس وقت تک موت بھی قبول نہیں کرے گی۔ جب تک کہ میں اپنے آئیڈیل سے نہیں مل لیتی۔

اے میرے خوبصورت آئیڈیل! تو مجھ سے دور سہی لیکن میں تم سے دور نہیں ہوں۔ میں تیری خیالی تصویر اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے لگائے ہوئے ہوں۔ تیرا دیدار میرے لیے جنت کے دیدار سے کسی طرح کم نہیں۔ جو مجھے میری زندگی کے میرے بچپن کے مسرت بھرے ایام کی یاد دلاتا ہے۔ تمہارا حسین چہرہ جو میرے دل اور آنکھوں میں نقش ہے۔ کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ تم یقین جانو اسے دنیا کا بڑے سے بڑا طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔ محبت کے بغیر زندگی ایک ناسور کی طرح ہے۔

اے میری آرزو کے درخشاں ستارے! میری آنکھوں میں جو تمہاری محبت کا فردوسی چراغ جل رہا ہے۔ اسے موت کی پر درد آندھی بھی نہیں بجھا سکتی۔

کبھی سوچتی ہوں کہ میں افسانے لکھنا شروع کر دوں افسانہ نگار کی بھی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ وہ اس دنیاوی ماحول سے

پرے بہت پرے اپنے تصورات کی دنیا میں بستا ہے۔
وہ شیزادیوں کی تمناؤں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ پریم کی سنہری وادی میں چکر لگاتا ہے۔ غریب کے آنسوؤں کے ساتھ وہ بہہ جاتا ہے۔ لیکن اس کے رنج میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اس کی خوشی میں کوئی لطف اندوز نہیں ہوتا۔ آخر میں کیا ہوا۔
وہی سرد آہیں۔ گرم گرم آنسو، جدائی کی روح فرسا گھڑیاں معصوم تمنائیں۔ رومانی ولولے، عظیم امیدیں اور بس!

. . . .

میرے پیارے آئیڈل! تمہارا خیال مونس تنہائی ہے۔ تم وہ ہو جسے زندگی میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ تم آنکھوں سے جدا ہو۔ مگر دل سے نہیں ——!

تمہاری یاد!!

وہ یاد جگر کے ٹکڑے کر دینے والی۔ جو صفحۂ دل پر دردانگیز جذبات کی اس گہری سیاہی سے منقش کی گئی ہے۔ جس کا مٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ وہ میٹھی چھری ہے۔ جس کی تیز دھار سے دل لہو لہان ہو رہا ہے۔ مگر اس میں وہ شیرینی ہے۔ وہ حلاوت ہے، کہ اسے کلیجہ سے دور کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ کسی کی یاد نے دل میں

چٹکیاں لیں۔ دل سے ہوک سی اٹھی۔ درد دل اس قدر بڑھا کہ ضبط کی طاقت نہ رہی۔

انسانی خصلت صرف جذبات کے دل میں رہنے سے ہی مطمئن نہیں ہوتی۔ جس سے تم محبت کرتے ہو۔ اس کے لیے اگر اپنی محبت کو اپنے سینے میں چھپاتے رکھو اور اس پر اپنے برتاؤ سے محبت کا اظہار نہ کرو۔ تو وہ بھی تمہاری محبت کی مقدار سے آگاہ نہیں ہو سکتا وہ تو تمہاری محبت کے جذبے سے اس وقت آگاہ ہوگا جب تم اپنا دل اس پر کھول کر رکھ دو گے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

دل اور آنکھ نے اپنا اپنا کام ایک ساتھ کیا دل سے آہ نکلی۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ بستر علالت بستر مرگ سا بن گیا کمسنی جانے کہاں چلی گئی۔ سچی خوشی بھی جاتی رہی۔ شباب آیا۔ نیک و بد کی تمیز بھی ہونے لگی۔ خیال تھا کہ عہد طفلی کی معصوم مسرتیں باقی رہیں گی۔ لیکن کہاں! شباب ہزاروں غم لاکھوں تفکرات اور دائمی پریشانیاں ساتھ لایا۔

اس کے آتے ہی میں بدل گئی۔ میرا زمانہ ہی بدل گیا۔ مسرت و شادمانی کا سورج طلوع ہوا اور اضطراب و پریشانی کا چاند نکل کھڑا ہوا۔

لیکن عصمت سب سے زیادہ قیمتی موتی ہے۔ اور یہی وہ چشمہ ہے۔ جہاں سے سکون اور مسرت کی ندی نکلتی ہے۔ اس کی قیمت تمام دنیا میں نہیں مل سکتی۔ موتی صرف اپنے آب کی وجہ سے انمول ہے۔ لعل بدخشاں اپنی چمک کی وجہ سے بیش بہا ہے۔ جب موتی کی آب چلی جاتی ہے جب لعل کی چمک دور ہو جاتی ہے۔ تو پھر کوئی شخص دو پیسے میں بھی اسے نہیں خریدتا۔

عورت کی آب، عورت کی چمک اس کی عصمت ہے جو عورتیں عصمت کو گوہر آبدار سمجھ کر اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ انمول ترین اور پرسکون ترین عورتیں ہوتی ہیں۔ وہ در بے بہا ہیں۔ نایاب جنس ہیں خدا ان سے خوش ہوتا ہے۔ دنیا ان کی عزت کرتی ہے۔ ان کا نام نہایت وقار سے لیا جاتا ہے۔

ان کا ذکر بڑے احترام سے ہوتا ہے۔

. . . .

مجھے تم سے شکوہ نہیں منصور! گلہ ہے تو مجھے اپنی تقدیر سے ہے۔ میں تو معصوم تھی اور زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر تھی مگر اس بات سے ناواقف نہیں کہ اس دنیا میں ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ ضرور مل جاتا ہے۔ تم نے مجھے زہر امرت بنا کر دیا تھا۔

میں نے بھی اسے امرت سمجھ کر پی لیا۔ حماقت کی میں نے بیوقوفی کی۔ تم کامران وشاد کام ہو اور میں بے قصور اور مورد الزام ہوں۔ اور ناکامیاب وغمگین ہوں۔ مگر اس نامرادی کے ساتھ خدا کے لیے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا آئینِ وفا یہی ہے۔ اور جذبہ محبت کا تقاضا صرف اسی قدر ہے۔

کہ جب اپنے جذبے کی تسکین کا سوال پیدا ہو تو ہر معمولی سے معمولی بات کو اصول بنا کر اسے آلہ کار بنایا جائے۔ مگر جب دوسروں کی ضرورتیں آواز بن جائیں تو کمال ہوشیاری سے اپنا دامن بچا لو اور مجبوریوں کی آڑ میں کترا کر نکل جاؤ۔

مجھے صرف اتنا بتا دے کہ تیرے ظلم کی شکار نیلو اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن اور تاریک راتیں کس کے سہارے بسر کرے؟ صرف اتنا بتلا دو کہ جب زندگی کی سیاہ راہوں پر زندگی کی شمع گل ہو جائے۔ تو ہم کیا کریں۔!

شاید تم اس کا جواب نہ دے سکو۔!

. . . .

مگر میں تمہیں اتنا ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ عورت ہزار پردوں کے اندر بھی مرد کو پہچان لیتی ہے۔ اس کی زبان بند ہوتی ہے۔

مگر اس کی نظر تیز ہوتی ہے۔

لیکن عورت محبت میں اپنے آپ کو یقین دلاتی ہے۔ کہ مرد سادہ لوح ہے۔ اور اس سے کبھی دھوکہ نہیں کر سکتا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ مگر عورت اس کی راست بازی کی قسمیں کھاتی ہے۔

عورت! عورت! بد نصیب عورت! دل میں زخم! مگر ہونٹوں پہ تبسم! کلیجے میں ہمک اٹھ رہی ہے۔ مگر زبان پر نغمہ ہے۔ اندر بیٹھ کر روتی ہے۔ مگر باہر نکل کر ہنستی ہے۔ اپنی بد نصیبی کو چھپا چھپا کر رکھتی ہے۔ اور لوگوں کو یقین دلاتی ہے کہ اس جیسی خوش نصیب عورت اس دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ اگر یہ نہ کرے تو کیا کرے؟ کیا اپنے گھر کو دوزخ بنائے۔ اپنے بچوں کو برباد کرے؟

دنیا کے سامنے اپنا کلیجہ چیر کر رکھ دے؟

پھر کیا ہوگا؟

کیا دنیا اس کے ساتھ ہمدردی کرے گی؟

ہرگز نہیں یہ دنیا اسے ٹھکرا دے گی۔

. . . .

مرد عورت کے دل کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ لاکھ کوشش کرے پھر بھی اس کے دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔

عورت کا دل تو ہمیشہ سے ایک علم رہا ہے۔ ایک سربستہ راز رہا ہے اور ہمیشہ ایک طلسم اور سربستہ راز ہی رہے گا۔

لمرمرد کے صبر و ضبط کی تو ایک حد ہوتی ہے۔ اور اس حد کے بعد وہ بے اختیار ہو جاتا ہے۔ مرد جو راز اپنے کانوں سے سننا چاہتا ہے عورت اسے کبھی اپنی زبان پر نہیں لاتی۔

اگر مرد عورت کے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھے تو وہ حیران رہ جائے۔

عورت جن نازک اور لطیف ترین جذبات کو اپنی روح کی گہرائیوں میں انتہائی احتیاط سے چھپا کر رکھتی ہے۔ انہیں وہ زبان پر کیسے لا سکتی ہے؟

مرد کا دل چنچل ہوتا ہے۔ مگر عورت اپنے شوہر سے وہ لاکھ بدکردار ہی کیوں نہ ہو کبھی نفرت نہیں کر سکتی۔ مگر مرد! مرد ایک بے وفا۔ خود غرض۔ مطلب آشنا۔ جابر، ظالم۔ اور خود سر اور جامہ انسانی میں چھپے ہوئے ایک خونخوار درندے کا نام ہے۔

مشرقی عورت سے بڑھ کر مرد کے لیے اور کوئی بیش بہا نعمت نہیں۔ وہ ایک بیش قیمت ہیرا ہے۔ جس کی قدر و قیمت سے مرد کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ عورت سراپا نور و تخیل ہے۔ اس کی

دنیا ئے تصور میں جب شباب کا آفتاب منور ہو اور نور بہتر ہوتا ہے۔ تو سب سے پہلے جس مردانہ حسن و جوانی کی کی تصویر آنکھوں میں سما جاتی ہے وہ اسے پھر بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس طرح بے وفا منصور! میرے دل سے ابھی بھی تمہارے لیئے دعائیں نکلیں گی۔ کیوں کہ میں نے تم سے محبت کی تھی۔ اگر تم اس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں یہی کہتی کہ میں نے تم سے محبت کی تھی۔ مگر تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ تم نے بہت برا کیا۔

....

نہیں نہیں فریدہ! خدا کے لیے میرے ساز دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھیڑنے کی کوشش مت کرو۔ ان سے اب نغمات کی جھنکار کی توقع عبث ہے۔ شکست نغمہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

کوئی میرے ساز دل کے تاروں سے کھیلتا رہا۔ اور اس کے ترنم میں کچھ ایسے کھو گیا۔ کہ ایک ایک کر کے اس کی

ظالم انگلیوں نے سارے تار توڑ دیئے۔ پھر وہ اس کی صدائے سامع فراش سے چونک اٹھا۔ اور جب دیکھا کہ ساز بیکار ہو گیا ہے۔ تو اسے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیا۔

اور دوسرا رباب اٹھا لیا۔

مگر شاید اس نے وہ آخری جھنکار نہیں سنی تھی۔ جو ساز کو یوں حقارت سے گلی میں پھینکنے پر بلند ہوئی تھی۔ اس میں سینکڑوں دکھی دلوں کی جگر پاش چیخیں تھیں۔ ہزاروں بیواؤں کے بین کا شور تھا۔

لاکھوں یتیموں کی دلخراش چیخ و پکار تھی۔ کروڑوں مظلوموں کی دردناک آہ و زاری تھی۔

کیا اب بھی مجھے بتانے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ شکست نغمہ کیا شے ہوتی ہے؟

تم مرد لوگ کس قدر خود غرض ہوتے ہو؟ موقع و محل کی نزاکت کا کبھی خیال تک نہیں کرتے

نفسیاتی خواہشات تمہیں بہت جلد مغلوب کر لیتی ہیں۔ میرے خیال میں عورت کا دل مرد کے دل سے زیادہ نازک اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

عورت جب محبت کرنے پر آتی ہے تو امیر غریب کو بالکل نہیں دیکھتی۔ اور ایک دفعہ جب اسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر دنیا کی کوئی بھی طاقت اس کی محبت کا رخ دوسری طرف نہیں موڑ سکتی۔

. . . .

O

۱۵

مجھے ہوائی محل بنانے کا بڑا شوق ہے۔

جب کبھی مجھے تنہائی یا یکسوئی میسر ہوتی ہے۔ تو میں نہایت ہی دلکش، خوبصورت، دل ربا۔ اور دلچسپ محل تیار کرنے لگتی ہوں۔ پہلے محل تیار کرتی ہوں۔ پھر انہیں توڑ ڈالتی ہوں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر جاذب نظر محل تعمیر کرنے شروع کر دیتی ہوں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے بکھرے ہوئے جذبات کو ایک جگہ جمع کرتی ہوں۔ اور اپنے خیالات، پریشان و تجربات و مشاہدات کے پھولوں سے حسین ہار تیار کر کے

ان دیویوں کے گلے میں ڈال دیتی ہوں ۔ آرزوئیں اور امنگیں ایک مدت ہوئی میرے دل و دماغ سے محو ہو چکی ہیں ۔ اب تو میری زندگی ایک ایسے خاموش دریا کی طرح گذر رہی ہے ۔ جس میں مدت سے کبھی تلاطم نہ آیا ہو ۔ دنیا میں چمکنے کی جو تمنا تھی ۔ وہ تشنہ تکمیل ہی رہی ۔

. . . .

خزاں کے دن تھے ۔

زرد پتے درختوں سے گر گر کر زمین پر چادر سی بچھا رہے تھے مرجھائے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں چاروں طرف منتشر ہو رہی تھیں ۔ اداسی میرے دل پہ تاریکی بن کر چھا رہی تھی ۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس دو دن کی بہار پر ناز کرنا فضول ہے جب یوں ہر بہار کا ناطہ خزاں سے بندھا ہوا ہے اور زندگی کا انجام آخر موت ہے ۔ تو اس بزم عشرت میں کوئی کیا نغمہ ریز ہو

چوں چوں کرتی ایک چڑیا میرے پاس سے گذر گئی ۔ یہ چاروں طرف خوشی کے نغمے گاتی ہوئی اڑتی پھر رہی تھی ۔ میں نے حیرت سے چڑیا سے کہا ۔

"تیرے پھول مرجھا گئے ہیں پھر بھی تو خوش ہے !"

"ہاں میری پیاری سہیلی میں خوش ہوں"
میں نے کہا۔
"جس شاخ پر تیرا آشیانہ تھا۔ اس کے سارے
پتے زمین پر گر پڑے ہیں۔ تو پھر بھی خوشی کے
نغمے گاتی پھر رہی ہے"؟
"ہاں میری پیاری سہیلی! میں پھر بھی خوشی کے نغمے
گاتی پھرتی ہوں۔
"اس کی وجہ کیا ہے۔؟"
"صرف اتنی کہ خوشی کبھی نہیں مرجھاتی۔ خوشی کی
شاخ کے پتے کبھی نہیں گرتے۔ سچی خوشی امر ہوتی
ہے اور معصوم ہوتی ہے اور بغیر کسی قیمت کے ہاتھ
آتی ہے"۔
اتنا کہکر چڑیا پھر سے اڑ گئی۔ میں اسے دیکھتی ہی
رہ گئی۔
میرے دن کسی کی محبت میں اداس ہیں اور میری راتیں کسی کے
فرقت میں طویل تر ہوگئی ہیں۔ میں باغ میں پھول کو سونگھتی
ہوں کہ شاید اس میں کسی کی وفا کی خوشبو مل جائے۔

لیکن جب لوگوں سے وفا کہیں سے بھی نہیں ملتی۔ جب اس دنیا میں مجھے کہیں بھی سچا ہمدرد نہیں ملتا۔ تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں پھر بھی خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ اے خدا تو میرے دل کو اتنا مضبوط بنا اور ایسا ضبط عطا کر کہ وہ زندگی کے صدمات کا استقبال صبر و ہمت سے کرے۔ میرا ہر دن نئے ارادوں سے شروع ہو اور میری ہر شام سکون و اطمینان پر ختم ہو۔

نیک نیتی میرا زادِ راہ ہو۔ در اصل یہ زندگی ایک آئینہ ہے۔ اس آئینے میں ہر شخص کو اپنی ہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ اور دوسرے کی شکل اسے بگڑی بگڑی نظر آتی ہے۔

زندگی میں کامیاب وہ ہوتا ہے۔ جس کی نیت نیک ہو اور شہرت اسے ملتی ہے۔ جو زیادہ شور مچاتا ہے۔

عورت کی زندگی میں روپیہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتے۔ وہ صرف زیور اور کپڑوں سے ہی خوش نہیں ہوا کرتی۔

بلکہ وہ کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ اسے سب سے زیادہ شوہر کی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسے شوہر کی محبت کبھی نصیب نہیں تو پھر زیور اور محبت ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اگر اس کی زندگی سے محبت کے عنصر کو الگ کر دیا جائے تو پھر باقی کچھ بھی نہیں بچے گا

وہ کپڑے پہنتی ہے۔ اس لیئے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے محبت کرنے والے کو خوبصورت معلوم ہو۔ اور کوئی اس کی پرستش کرے۔ لیکن جب کوئی اس کا پرستار ہی نہ ہو۔ تو پھر اسے آرائش کی اشیا کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

عورت ایک پھول ہے۔ خوش رنگ، نازک اور خوشبودار لیکن وہ پھول ہی کیا جو کسی کے گلے کا ہار نہ بن سکے۔

. . . .

اسی طرح میں نے بھی کسی کے گلے کی زینت بننے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے ٹھکرا کر چل دیا۔ شب تنہائی میں اس کی یاد اب بھی آ کر مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ اور پہروں آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب چاند اپنی سیمیں کرنوں سے دنیا کو منور کر دیتا ہے، اور ستارے اس کے گرد آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ دنیا کا ذرہ ذرہ نیند کی آغوش کے جھولے میں جھولتا ہے تو میں اس کی بے وفا یاد میں محو ہو جاتی ہوں جب مست و مخمور ہوائیں چلتی ہیں۔ جب کوئل کے میٹھے نغموں سے فضا مخمور ہو جاتی ہے۔ جب دنیا میں عیش و سرور کے قہقہے گونج اٹھتے ہیں۔ تو میں کسی کی یاد میں بے قرار ہو جاتی ہوں۔

. . . .

اس لیے کہ محبت طبعی ہوتی ہے۔ یہ دل سے از خود اٹھتی ہے۔ یہ کسی کے کہنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ جس کو ہم نے عمر بھر نہیں دیکھا جس کے مذاق و خیالات کا بھی ہمیں علم نہیں اور جو سوئے اتفاق سے ہمارے ساتھ وابستہ ہو گیا ہو۔ اس سے محض والدین کی خوشنودی کی خاطر ہم کس طرح محبت کر لیں! وہ محبت جو کسی دباؤ یا اخلاقی زور سے پیدا ہوئی ہرگز ہرگز محبت نہیں کہلائی جا سکتی۔ خود غرضی سے وہ اور خود غرضی محبت کی موت ہوتی ہے۔ میرے بچھڑے ہوئے خواب! میری محبت اور میری راحت صرف تم ہو۔ میری ساری زندگی اور دنیا بھر کی مسرتیں صرف تم سے وابستہ ہیں تمہاری خدمت میرے لیے عین راحت ہے۔ تمہیں بھول جانا اپنی خوش نصیبی کو بدبختی میں تبدیل کرنا ہے۔ تمہاری یاد میری روح کے لیے ہمیشہ تقویت کا باعث ہوگی۔

تمہارا روح پرور تصور میری زندگی کے تمام لمحوں میں میرے دماغ پر ثبت رہے گا۔ اگر محبت بھی کوئی مادی شے ہوتی تو اس کی بھی ایک مقدار مقرر ہوتی ہے۔ تو پھر شاید میں تمہیں بتلا سکتی کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں۔

عورت کی ساری تاریخ شروع سے آخر تک محض محبت ہی محبت

ہے۔ اور حسن اس کے خیالات کا محور رہا ہے۔ وہ محبت کے لیے
اور محبت کی خاطر پیدا کی گئی ہے۔ مرد میں عشق عورت کی خوبصورتی
سے پیدا ہوتا ہے۔ عورت کی اس صفت پر وہ اس کی تمام پوشیدہ
صفات کو قربان کر دیتا ہے۔ مرد کے لیے عورت ایک تازہ شکار سے
زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اور اس کی عشق بازیاں تلاش شکار کا
دوسرا نام ہے۔ سب مرد یہی چاہتے ہیں کہ ہم عورتوں کے جذبات
عشق کو اپنے احساسات پر قیاس کریں۔ اور ہمارے قلب نازک کے
تاثرات کا اندازہ اپنے سخت دلوں کے ہنگامہ رجنگ کی بیتابی سے
کریں۔

لیکن مرد کی خوبصورتی عورتوں کے لیے شرط عشق نہیں ہے۔
عورت کی تیز نگاہ مرد کی سیرت کو دیکھتی ہے اور اسی سے محبت
کرتی ہے۔ لڑکیوں کو اس لیے تعلیم دی جاتی ہے کہ آگے چل کر وہ
اچھی مائیں بن سکیں۔ اور اگر ماں کی گود جو انسان کا اولیں گہوارہ ہوتی
ہے۔ اچھی نہ ہوئی تو بچہ کسی طرح سلیقہ مند ہو گا۔

دوسری قوموں کی بے حجابی دیکھکر مشرق کی عورتیں بھی بے حجاب
ہو کر پھرنے لگی ہیں۔ لیکن بہت جلد انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ
ایک مردہ تہذیب کا کفن نوچ رہی ہیں۔

. . . .

عورت کا دل محبت کے پانی سے سرسبز و شاداب ہوتا ہے ہمارے قوانین سے کہیں زیادہ عورت کی نگاہوں میں اثر اور قوت اور لطافت ہوتی ہے۔ جس مکان میں عورت نہیں سمجھ لو کہ اس مکان میں شگفتگی اور مسرت کا گذر نہیں ہے۔

دنیا بھر میں کوئی ہیرا، کوئی موتی اتنا بیش قیمت نہیں ہوتا جتنی کہ ایک پاک باز باعصمت عورت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ان موتیوں سے بھی زیادہ انمول اور قیمتی ہوتی ہے۔

عورت بے شک دنیا کی زینت ملکوں کی آبادی اور قوس قزح کی عزت اور وقار ہے۔ اگر اس دنیا میں عورت کا وجود نہ ہوتا تو مسرت کا لفظ کسی زبان کی لغت میں نہ مل سکتا۔ کیوں کہ مسرت عورت ہی کے دل سے قائم ہے۔ عورت کے جذبات محبت اس قدر عمیق ہوتے ہیں۔ کہ ان کی تہہ تک پہنچنا ممکن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اس سمندر کی گہرائیوں تک جا پہنچتی ہیں

. . . .

خوبصورت، شوہر پرست اور نیک عورت واقعی اس دنیا کی حور ہے۔ وہ اسی قابل ہے کہ خوشبو بن کر پھولوں میں جا بسے۔ چاندی

بن کر ماہتاب کے ضیا پوش ہو۔ روشن ہو کر آفتاب سے جلوہ ریز ہو اور آب بن کر جواہرات کی آبرو بڑھاتے۔

اس کے سینے میں مسرت اور امنگ کا چراغ روشن ہوگا۔ اور اس چراغ کی روشنی سے ارد گرد کی فضا منور ہوگی۔

خزاں کا موسم بیت گیا۔

نسیم۔ بہاری پتی پتی کو خوبصورت بنانے میں ہمہ تن مصروف ہے خوشنما پھول اپنی مست کن خوشبو سے فضا کو معطر کر رہے ہیں۔ اور نوعمر بلبلیں گلاب کی جھاڑیوں میں محبت کے راگ الاپ رہی ہیں۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ اور اپنی سفید براق چاندنی سے خواب میں ڈوبی ہوئی دنیا کو منور کر رہا ہے۔

لیکن میں کسی کی یاد میں محو ہوں۔ دل میں ہزاروں حسرتیں لیے دریائے نیل کی لہریں اس لیے خاموش ہوتی تھیں۔ کہ قلوپطرہ کو انطنی سے کچھ کہنا ہوتا تھا۔ جو صرف اس لیئے تاریک ہوتی تھیں کہ قلوپطرہ کے چہرے کا چاند چمک سکے۔

ان نئے زخموں نے پرانے گھاؤ بھی ہرے کر دیئے ہیں۔

میری ان سیاہ آنکھوں میں آنسو اس طرح چمک رہے ہیں۔

جیسے کالی گھٹاؤں میں پانی — میری موت کا رتھ بڑی شان سے

آسمان کی جانب روانہ ہوگا۔ جہاں چاند اپنے نقرئی تھال میں تارے لیے میرے انتظار میں ہوگا۔ اس وقت میرے حافظے میں تمہارے بوسے اور میرے آنسو چمک رہے ہیں۔ تمہاری بے وفائیوں نے کئی بار میری آنکھیں پرنم کی ہیں۔

میری بکھری ہوئی یادیں پگھل کر میری آنکھوں میں آگئی ہیں

تمہارے آنے سے میری زندگی کے ویرانے میں بہار

آگئی ہے۔

لیکن تم میری دنیا میں ایک ایسی آگ لگا کر چلے گئے

جسے میں اب تک نہیں بجھا سکی۔

اور شاید زندگی بھر نہ بجھا سکوں گی۔

زندگی کی کتاب میں اگر اوپر تلے خالی اوراق میں

شامل ہوتے چلے جائیں۔

تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔

زندگی کی یہ خالی کاپی جو ہمارے ہاتھوں میں

تھما دی گئی ہے۔

ہمیں اس کے ہر ورق پر اچھے حروف لکھنے چاہئیں۔

میری زندگی ایک چٹیل میدان ہے۔ جس میں ان بیتے دنوں کی یاد ایک خوبصورت قبر کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔

. . . .

○

۱۶

میری جانِ تمنّا!

تمہارا خط اس وقت مجھے ملا جب کہ امید کا پاکیزہ رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ کاش تم یہ جملہ نہ لکھتی کہ سیر و تفریح کا موسم آگیا ہے۔ کاش! تم جانتی کہ ابر آلود آسمان میں بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج کو صرف تم لوگوں کو پیغام دیتا تھا۔ کہ اے وہ جو شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے آئے ہو اس چار دیواری سے باہر نکلو اور دیکھو کہ دور برف پوش پہاڑ کن آنکھوں سے تمہیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ ایسے پہاڑ جنہیں برف نے مرمریں بنا رکھا ہے۔ آؤ اور ان کی بلندیوں پر چڑھ جاؤ۔ جن کی

دامنوں میں ہری بھری کھیتیاں آباد ہیں۔ جن کی ہریاول آنکھوں کو زندگی بخشتی ہے۔ بہتی ہوئی ندیاں۔ جن کے کنارے لہلاتی ہوئی۔ گلاب کی جھاڑیاں جن میں معطر ہوائیں ہر طرف عطر بیزی کرتی رہتی ہیں۔

دوستوں کی بے وفائی۔ دنیا کی بے قدری۔ زندگی کی تلخی ایک زہر آلود نشتر بن کر میرے دل میں اتر گئی ہے۔ وقت اور ماحول کی کڑی زنجیروں میں انسانی زندگی دم توڑتی نظر آ رہی ہے۔"

چراغ امید کی زرد لرزاں کرنیں اپنے آخری دموں پر ہیں۔ میری زندگی کا تخیلی عنصر! میرے ننھے سے دل کے اندر بھی زندگی کی ایک چھوٹی سی چنگاری سلگ رہی ہے۔ اور تا حشر سلگتی رہے گی۔ منصور! میں نے تم سے محبت کی۔ میری محبت کی راکھ میں ابھی تک اسی کی محبت کی چنگاریاں موجود ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ مگر میں اس خیال سے آزردہ نہیں ہونا چاہتی کہ تم نے بھی مجھے واقعی بھلا دیا ہوگا۔ مجھے ہر جگہ ان جذبوں کو دور کرنے کی ایک بے چین سی خواہش نظر آتی ہے۔ تشدد کی مٹھی سے انسانیت کا گلا چھڑا لو اپنی گردن پیش کر دے۔ جب حق پر آنچ آ رہی ہو۔ جب صداقت پامال ہو رہی ہو۔ جب انسانیت

حیوانیت کے پنجوں میں دم توڑ رہی ہو۔ اس وقت صرف یہی
ہو سکتا ہے کہ حقیقت کی قربانی کر کے سچائی کو بچا لیا جائے۔
منصور کے خیال کو دل سے نکالنے کی سکت مجھ میں منبس ہے
جب میں اپنی گذشتہ زندگی کا جائزہ لیتی ہوں تو میں اس پر
ایک طوفان عظیم کے نشانات بکھرے ہوئے دیکھتی ہوں۔ وہ
حقیقی خوشی حقیقی نہیں جس میں کم از کم ایک اور انسان آپ
کے ساتھ شریک نہ ہو۔ لیکن حقیقی غم وہ ہے جسے انسان تنہا ہی برداشت
کرے۔

اگر ایک طویل مدت کے بعد حرف محبت زبان پر آئے تو دل
میں خوشیوں کے شادیانے بجنے لگتے ہیں۔ گزرتی ہوئی صبحیں
اور بیتے ہوئے دنوں کے مدھم نقوش چھوڑہ یاد پر ابھرنے
لگتے ہیں۔ جیسے مسلے ہوئے پھولوں سے اچانک خوشبو
آنے لگے۔ جیسے کوئی نوحہ خود بخود ایک مسرت کا راگ بن جائے
ناکامی آرزو کے تلخ احساس نے طبیعت کو بے حد حساس بنا دیا
ہے۔ اور زندگی اس اداس تنہا ندی کی طرح بن کر رہ گئی ہے
جو کسی جنگل میں سے دوپہر کو چپ چاپ گذر رہی ہو۔
خیالات ماضی کے کھنڈروں میں آوارہ گھومتے رہتے ہیں۔

مگر میں اب اپنے ان دنوں ان اداس لمحوں میں اس زندہ حقیقت کا سہارا لے لیا کرتی ہوں کہ دنیا میں ہر شئے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر خزاں بہار کی آمد کا پیش خیمہ ہوتی ہے اگر ہنستے رہنا ہی زندگی ہے تو ہم بسا اوقات آنکھوں میں آنسو لے کر بھی ہنستے رہیں۔

اور پھر مجبوریاں ضبط کے انداز سکھا ہی دیا کرتی ہیں۔ انسان ہر زخم کو وقت کے ساتھ بھول جاتا ہے۔ لیکن دل کا زخم کبھی نہیں سیا جاتا۔

مجبور انسان بڑا بے بس ہوتا ہے۔

عورت صنفِ نازک نہیں ہے۔ اسے کہہ کہہ کر ایسا بنا دیا گیا ہے۔ اس کی نگاہوں کا حسن و جلال! المناک گہرائیاں مجبور زندگیاں بڑی حسرتناک حالت میں ختم ہو جاتی ہیں۔ دنیا ان کو مسکراتا ہوا بھی دیکھتی ہے۔ ان کے قہقہے بھی سنتی ہے۔ لیکن ان کے سینے میں دبی ہوئی سسکیاں اور آہوں کو نہیں دیکھ سکتی وہ ان زخموں کا مداوا نہیں کر سکتی۔ جو رات کی تاریکی اور تنہائی میں آنسوؤں کے ساتھ دھوئے جاتے ہیں۔ جب دل کو صدمہ پہنچتا ہے تو آنسو خود بخود نکل پڑتے ہیں۔ ٹھیس سے دکھ جانا دل کی

فطرت ہے۔ اور جب دل دکھے تو آنسو کیوں نہ بہیں!

یہ آنسو پھر نہیں سمیٹے جا سکتے

میرے سینے میں مچلتی ہوئی آرزوئیں بعض اوقات میرے لبوں پر آجاتی ہیں۔ میں بیٹے دھندلکوں میں ابھی تک ایک روشن کرن کی منتظر ہوں۔ جو شاید میری زندگی کے اندھیاروں کو اجالے میں تبدیل کر دے۔ اور پھر حیات۔ ایک شیریں رقص۔ جاوداں رقص بن کر رہ جائے۔

. . . .

آخر تمہاری محبت کو کیا ہوا۔؟

تم نے جو اتنے وعدے مجھ سے کئے تھے۔ وہ سب کدھر چلے گئے؟ اگر تمہیں مجھ سے اسی طرح کرنا تھا۔ تو مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا میرے پاس سوائے تمہاری بے وفائی کے داغ کے اور کوئی نشانی بھی نہیں ہے۔ اور میں صرف تلخ یادوں کے سہارے اتنی لمبی چوڑی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ تمہاری یاد تازہ کرنے کے لیے بھی تو کسی آسرے کی ضرورت ہے۔

شاید میری زندگی کا افسانہ ان زخموں کو منظر عام پر لاتا ہے۔ جو ہماری سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔

اور جب تک یہ گھٹن ہماری سوسائٹی میں موجود ہے۔ اس وقت تک ہم ان کو منظر عام پر لاتے رہیں گے۔ قدرت کی ہر تخلیق بے عیب اور بے ضرر ہوتی ہے۔ حال کا مجرم ماضی کی پیداوار ہے۔ اور مستقبل کا مجرم ابھی زیر تعبیر ہے۔ ایک زہر آلود احساس کے گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ اور پھر کون جانے کہ ان کی رگ غیرت میں چبھا ہوا نشتر نہ صرف اس میں بلکہ اس کے ماحول میں بھی کتنے بے پناہ ہنگامے بکھیر دے۔

ہر نقش جب گہرا ہونے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ تو مٹ جاتا ہے۔ فضا میں ہر لمحہ تیرتے ہوئے ہنگامے ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیں۔ زندگی ماحول کے ساتھ کش مکش کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اگر اسی کش مکش کا مفہوم، سکوت زیر شکست کی بجائے کسی فاتحانہ صلح میں تلاش کرے۔ جو ترنم بھی ہو۔ اور سکون بار بھی۔ تو شاید انسانیت کی روح پرورداری اس کے وجود پر فخر کر سکے۔ کمزوری کے احساس کے بعد زندگی سے فرار کمزوری کا مداوا نہیں پیدا کر سکتا۔ مداوا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنی کمزوری پر خود مسکرانے کے بعد اسی تند دھارے کا رخ جو اسے ہلاکت کی طرف لیے جا رہا ہے۔ ایک ایسی سمت

کا موڑ دے۔ جہاں اسی کے بے بنیاد خوابوں کو شرمندہ تعبیر ہونے کا سنہری موقع مل سکے۔

اسی شکست کے رد عمل کے طور پر انتقام کے اسی پس منظر میں پلتا ہوا احساس کمتری دائرہ شعور میں آجاتا ہے۔ اور پھر بعد میں یہ احساس آئندہ زندگی کی تمام جدوجہد کو زہر آلود کر دیتا ہے لیکن اکثر خود فریبی اسے سہارا دیا کرتی ہے۔ اور احساس کمتری نفرت کے دامن پہ اپنا مداوا تلاش کر لیتی ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ میری آنکھوں میں منصور کو پہلے پہل میری گہری آنکھوں میں اداسی نظر آتی تھی۔ میرے چاروں طرف ایک گہرا خلا تھا۔ آج بھی جب مجھے اس پہلی ملاقات کا خیال آتا ہے۔ تو دل کی سطح پر غم کی موجیں اٹھنے لگتیں ہیں۔ جیسے ساکن سمندر میں طوفان آنے والا ہو۔ لیکن موجیں تلملا تلملا کر رہ جاتی ہیں۔ چپ ہو جاتی ہیں۔ سمندر پھر ساکن ہو جاتا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن اب کی بار کچھ اور ہی قسم کی موجیں اٹھنے لگی ہیں۔ دل کی نازک سطح پر ان کے زیر دست تھپیڑے نوکیلے برچھوں کی طرح پڑ رہے ہیں۔

٥

۱۷

میری زندگی میں ایک نیا انقلاب آیا۔

اور یہ انقلاب وحید کے ساتھ داخل ہوا۔ وحید کو پہلی بار میں نے کالج کی ایک تقریب میں دیکھا۔ یہ تقریب یونیورسٹی کے ہال میں ہو رہی تھی میں بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کالج کی پرانی طالبات کی حیثیت سے گئی ہوئی تھی۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اگلی قطار میں بیٹھی تھی۔ تقریب کا آغاز ایک قومی گیت سے ہوا۔ یہ گیت ایک نازک سے چہرے والے بڑی دلربا آنکھوں والے بڑے دبلے پتلے لڑکے نے گایا۔

میں اس لڑکے کی درد بھری آواز سے بڑی متاثر ہوئی۔

آخر میں اسی لڑکے نے جس کا نام وحید بتایا گیا تھا پھر ایک گیت گایا
یہ گیت ایک بھجن تھا۔ میرا بائی کا بھجن! کچھ لوگوں نے بھجن کے
نام پر ناک سکیڑ لیے۔ مگر وحید برابر گائے گیا۔

کوئی کچھ کہے من لاگا رے
ایسی پریت لگی ساجن سے
جوں سونے پر سہاگا رے
اپنا پتا سب کٹم قبیلہ!
ٹوٹ گیا جوں تاگا رے
میرا کے پربھو گردھر ناگر
بھاگ ہمارا جاگا رے
کوئی . . . .

بڑا ہی درد بھرا اور غم انگیز گیت یا بھجن تھا اور اس پر
وحید کی آواز بڑی پیاری ملائم اور افسردہ تھی۔ یوں معلوم ہو
رہا تھا۔ جیسے ہم ہزاروں سال پہلے کے ہندوستان کے
جنگل میں واقع کسی پرانے مندر میں پہنچ گئے ہوں۔ جہاں ایک
کالی کالی آنکھوں والی دیوداسی زرق برق لباس پہنے رقص
کر رہی ہے۔

تقریب کے بعد وحید میری ایک سہیلی کے پاس آیا۔ وہ سہیلی وحید کی بہن تھی۔ وحید نے شرما کر مسکراہٹ سے کہا۔

"کیوں باجی اچھا گیت تھا ناں؟

"بہت ہی پیارا تھا۔ مگر تم شرما کیوں رہے تھے؟"

اس پر وحید اور شرما گیا۔ اس کا دلربا سانولا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے آنکھیں نیچی کر لیں اور بولا۔

"ابھی زیادہ لوگوں میں گانے کی عادت نہیں ہے ناں۔

اگلے روز میں وحید کے گھر گئی۔ اس کی بہن نے جو میری سہیلی تھی۔ مجھے چائے پر بلایا تھا۔ اپنی زندگی کی سنہری شاموں میں وہ شام بھی ایک سنہری یادگار شام تھی۔

وحید کا گھر شہر سے باہر ایک بڑے ہی پر فضا مقام پر واقع تھا۔ کوٹھی کو چاروں طرف باغ نے گھیر رکھا تھا۔ اس باغ میں یوکلپٹس اور شہتوت کے درخت تھے۔ اور گھاس کے قطعوں میں گلاب کے سفید، سرخ اور زرد پھول مسکرا رہے تھے۔

میں نے پہلی بار وحید کو یہاں اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے دیکھا۔ میں شرما گئی۔ وحید کی نگاہوں میں ایک عجیب قسم کی گرمی اور شدت تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ نظر میں سورج

کی کرنوں کی طرح میرے جسم کے اندر سرایئت کر رہی ہیں۔

وحید نے میرے اصرار پر ایک گیت، ہارمونیم پر سنایا۔ اُس نے کہا۔

"کیا سنیں گی آپ؟"

جو آپ کا دل چاہے "

"دل کی بات نہ کریں۔ دل بڑا خطرناک ہوتا ہے۔"

"مجھے ایسا قبول ہے۔ میں دل کی بات پر ہمیشہ عمل کرتی رہی ہوں۔ اور میں آپ کے دل کی آواز سننا چاہتی ہوں۔"

"وحید! یہ میری سہیلی ہے۔ کوئی ان پڑھ عورت نہیں ہے۔ تم باتوں میں اسے شکست نہیں دے سکتے"

"شکست و فتح کی کوئی بات نہیں۔ میں تو بڑی سیدھی سادھی بات کر رہی ہوں۔"

وحید نے ہارمونیم پر ہاتھ رکھ کر سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھایا اور میری طرف غور سے دیکھکر بولا۔

"جیسے آپ کا حکم"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہارمونیم پر انگلیاں رکھ دیں اور موسیقی کی لہریں کمرے میں گونج اٹھیں۔ اس کے بعد اس نے چہرہ ایک طرف کو جھکا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے یہ غزل چھیڑ دی۔

گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے
رین دو رین کا بسیرا ہے
جی کو بڑھتی ہوئی اداسی نے
کیا اکیلا سمجھ کے گھیرا ہے
آرزو بوجھ بڑھتا جائے گا
چل گھر اپنا ابھی سویرا ہے

آرزو کی غزل تھی۔ غزل بھی درد بھری تھی اور پھر وحید نے گائی بھی بڑے درد ناک سروں میں تھی۔ میرا تو دل ہل گیا۔ میں چپ سی ہو کر بیٹھی رہی۔ میں وحید کو تک رہی تھی۔ میں اپنے ماضی کے ویران شبستانوں میں نکل گئی تھی۔ پرانی زندگی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وحید کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے موڈ میں کھو گم گا رہا تھا۔ جب اس نے گانا بند کیا۔ تو آہستہ سے آنکھیں کھول دیں

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں ایک طرح کی اداسی اور جلال ملا ہوا تھا۔

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے جانے وحید نے گانے کے دوران کیا دیکھ لیا ہو۔ میں نے کہا۔

"آپ نے بڑی درد بھری غزل گائی"

"غزل درد بھری تھی یا اس کی طرز"

"دونوں چیزیں ہی درد بھری تھیں اور پھر آپ کی آواز ان سبھوں سے زیادہ پر اثر تھی"

"آپ کا شکریہ!"

اس کے بعد ہم سبھوں نے مل کر چائے پی۔ چائے کے بعد وحید کی بہن کھانا پکانے چلی گئی۔ وحید بھی اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں بیٹھی اپنے ذہن کے تانے بانے کو سلجھاتی رہی۔

پھر وہاں سے اٹھی اور باہر باغ میں آگئی۔

باہر باغ میں آکر میں نے دیکھا کہ وحید ایک گلاب کی جھاڑی کے پاس سبز رنگ کے بنچ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

میں نے قریب جا کر کہا۔

"میں آپ کے مطالعے میں مخل تو نہیں ہوئی!"
وحید نے چونک کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔
"بالکل نہیں۔ بالکل نہیں بیٹھئے"
مجھے وحید کے اس اخلاق نے بڑا متاثر کیا۔ حالانکہ مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا۔ کہ میں وحید کے مطالعے میں مخل ہوئی ہوں۔ میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔
"یہاں گلاب کے پھولوں کی کس قدر گہری خوشبو پھیلی ہوئی ہے"
وحید نے بھی ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔
"جی ہاں! گلاب کی خوشبو بڑی ہی پیاری ہوتی ہے۔ یہ بہار کی دل آویز صبحوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔"
"معلوم ہوتا ہے آپ کو پھولوں سے بڑا شغف ہے۔"
"جی ہاں۔ ہر آدمی کو پھولوں سے پیار کرنا چاہیئے۔ پھول قدرت کے بے زبان سفیر ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر انسان کو محسوس ہوتا ہے۔ کہ خدا اگر چاہے تو ایک حسین عورت کو زبان سے محروم بھی کر سکتا ہے۔"
وحید نے بڑی ہی پیاری تشبیہ دی تھی۔ بڑے دل آویز انداز میں پھول کی تعریف کی تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ شعر کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔

"قدرت کی زبان بھی شاعر کی زبان ہے۔ اور انسان کو قدرت کی پیروی کرنی چاہیئے۔

"لیکن ہمارے ہاں تو شاعری کو برا سمجھا جاتا ہے۔

وحید مسکرایا۔

یہاں تو کئی ایسی چیزوں کو برا سمجھا جاتا ہے۔ جو حقیقتاً بری نہیں ہیں۔ اور اس کے برعکس کئی ایسی چیزوں کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ جو حقیقتاً اچھی نہیں ہیں۔

میں خاموش ہوگئی۔ میں نے بات کا موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"میں پوچھ سکتی ہوں یہ کونسی کتاب آپ پڑھ رہے ہیں؟"

جی ہاں۔ یہ ٹیگور کی گیتا نجلی ہے"

"یہ اس کی وہ ہی نظمیں ہیں ناں۔ جس پر اسے نوبل پرائز ملا تھا۔

"جی ہاں"

"کیا آپ مجھے اس کی کوئی نظم پڑھ کر سنائیں گے؟

"ضرور ضرور۔ جب گلاب کے پھول پاس ہی کھلیں ہوں اور ایک خوبصورت عورت پاس بیٹھی ہو تو

منہ سے ہر جملہ گیت بجلی کا شعبہ بن کر نکلتا ہے۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

کیا یہ بھی کوئی نظم تھی!

وحید ہنس پڑا۔

" آپ بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔

خیر نظم سنیئے۔ کونسی نظم سناؤں گا۔

" جو آپ کو پسند ہو "

" بہت اچھا۔

وحید نے کتاب کے کچھ اوراق پلٹے اور پھر انگریزی میں ایک نظم سنائی اس کی آواز سرگوشی بن گئی تھی اور یوں لگتا تھا۔ جیسے خزاں کی ہوا درختوں کے پاس جا کر انہیں چپکے چپکے آنے والی بہار کا سندیسہ سنا رہی ہے۔

نظم کا ترجمہ یہ تھا۔

" روشنی۔ آہ روشنی۔ کہاں ہے۔؟ تو!

اسے خواہش کی آتش سوزاں سے روشن کر

چراغ تو موجود ہے۔ مگر شعلے کی ٹمٹماہٹ کبھی دیکھنے

میں نہیں آئی۔

اے دل ! ایسی تیری قسمت ہے ! افسوس تیرے
لیے تو موت ہی بدرجہا بہتر تھی !

محبت ! تیرا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ اور اس کا پیام
ہے کہ تیرا مالک جاگ رہا ہے اور وہ رات کی تاریکی
میں تجھے محبت کی ملاقات کے لیئے اپنے پاس
بلا رہا ہے۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ بارش لگاتار
ہو رہی ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ وہ کیا شے ہے۔ جو
میرے اندر جوش و ولولہ پیدا کر رہی ہے۔
میں اس کے معنی نہیں سمجھتا۔

بجلی کی ایک لمحہ بھر کی چمک میری نگاہ پر
عمیق تر تاریکی ڈال دیتی ہے۔

اور میرا دل اس راہ کو ٹٹولنے لگتا ہے۔ جو
اس مقام کی طرف جاتی ہے۔ جہاں رات کا نغمہ مجھے
بلا رہا ہے۔

روشنی ! آہ روشنی کہاں ہے ؟ اسے خواہش
کی آتش سوزاں سے روشن کر دے۔ بجلی

کڑکتی ہے۔ ہوا خلا، میں چیخ رہی ہے اور رات
سنگ سیاہ کی مانند کالی ہے۔

اندھیرے میں کہیں وقت گذر نہ جائے
اپنی زندگی سے چراغ محبت روشن کرے !"

اس کے بعد وحید نے کچھ کہے بغیر دوسری نظم شروع کر دی

"میں اپنی ملاقات کے مقام پر اکیلا چلا آیا ہوں
مگر یہ کون ہے؟ جو خاموش تاریکی میں میرے
پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔
میں اس سے بچنے کے لیے ایک طرف ہو جاتا
ہوں۔ لیکن اس سے بچ نہیں سکتا۔ وہ اپنی
خود پسندانہ چال سے زمین سے دھواں اڑاتا۔ اور
میرے ہر لفظ پر جو میں بولتا ہوں اپنی آواز بلند کرتا
ہوا چلا آرہا ہے

. . . .

وہ میری اپنی ہی چھوٹی سی خودی ہے وہ شرم
کو جانتی ہی نہیں۔ مگر اسے اپنے ساتھ لے کر
تیرے دروازے پر آنے میں شرم محسوس

کر رہا ہوں۔

باغ میں خاموشی چھاگئی۔ ٹیگور کی نظموں کے ساتھ ساتھ وحید کے پڑھنے کے انداز کا تاثر ابھی تک فضا پہ چھایا ہوا تھا۔

یوں لگتا تھا۔ جیسے باغ کا ہر درخت اور درخت کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا ہمہ تن گوش ہوکر وحید کی زبان سے وہ دونوں نظمیں سن رہا تھا۔ میں نے آہ بھر کر کہا۔

"کتنی پیاری نظمیں تھیں!"

وحید نے سگریٹ سلگایا۔ اس کا ایک ہلکا سا کش لیا اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔

"ٹیگور بہت بڑا رومانک شاعر تھا"

اس کے بعد پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی۔ میں نے کہا۔"

"کیا آپ بنگالی پڑھ لیتے ہیں؟"

"نہیں۔ تھوڑی بہت بول لیتا ہوں"

"کیا یہ زبان سیکھی تھی آپ نے۔۔"

"سیکھی تو نہیں تھی۔ البتہ آ گئی تھی۔ مجھے دو سال
کلکتہ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اور بس وہیں سے
یہ زبان آ گئی۔

میرا دل بنگال کے جنگلوں میں جا کر کسی پر سکون
نیلی جھیل کی سطح پہ سفید کنول بن کر دھڑکنے لگا۔
اور میرے کانوں میں بندرابن اور سندربن کے جنگلوں میں راتوں
کو دھاڑنے والے زرد چشم چیتوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔
پھر میں نے شریفہ کے پیڑوں تلے بیٹھے ہوئے بیراگیوں
کو اک تارے پر خدا کی الوہیت کے گیت گاتے سنا۔
میں بھی بنگالی سے شناسا تھی۔ کلکتے میں بھی رہ کر آئی تھی
اور میں نے بھی بنگال کی کافی سیر و سیاحت کی تھی اور مجھے ان کا
کلچر بڑا پسند آیا تھا۔ پیارے پیارے رنگوں والی ساڑھیوں میں
ملبوس نازک اندام آہو چشم بنگالی عورتیں جن کے جوڑوں میں
نرگاریاں اور چنبیلی اور موتیے کے سفید شگوفے خوشبو اڑا
رہے ہوتے ہیں۔ جو اداس ہوتی ہیں سہمی رہتی ہوں گی۔ جب
بھی اداسی ان کے چہروں پہ مسلط ہو گی۔ مجھے بنگال کی یہ اداسی
ہی بہت پسند تھی۔ اور ٹیگور کے گیتوں میں بھی اداسی رچی ہوئی

تھی ۔ وحید کی آواز اور چہرے پر بھی بنگال کی اداسی کندہ تھی جب وہ گاتا تھا تو لگتا تھا کہ بنگال کی اداسی کو زبان مل گئی ہے ۔ میں نے کہا ۔

" میں بھی بنگال سے بڑا پیار کرتی ہوں "

وحید نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا ۔

" بنگال اسی لائق ہے ۔ کہ اس سے محبت کی جائے ۔

" بلکہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ وہیں جا کر کسی گرلز کالج میں نوکری کر لوں ۔

" آپ جا سکتی ہیں ۔ وہاں آپ کی بڑی قدر ہوگی کیوں کہ مشرقی پاکستان کے کالجوں میں اردو کی ابتدائی تعلیم کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں ۔

" لیکن میں اکیلی وہاں نہیں جا سکتی ۔ "

وحید مسکرایا ۔

" آخر مشرقی عورت ہیں ناں ۔ اکیلی گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتیں آپ "

میں نے کہا ۔

" مشرقی کا سوال نہیں ۔ گھر سے اکیلی باہر تو مغربی عورت

بھی کم ہی نکلتی ہو گی "

" خیر کچھ بھی ہو۔ ویسے اگر آپ کو گوارا ہو تو میں
آپ کے ساتھ وہاں چلنے کو تیار ہوں "

میں تو حیران سی ہو کر رہ گئی۔ بلکہ دم بخود ہو کر رہ گئی
یہ وحید نے کیا کہہ دیا۔ اور کیوں کہہ دیا!

" یعنی آپ صرف میری خاطر میرے ساتھ بنگال جانے
پر تیار ہیں کیا؟"

وحید نے مسکرا کر کہا۔

" ایسی بات تو نہیں ہے۔ بلکہ میں خود وہاں جانے
والا ہوں۔ اگر آپ بھی ساتھ ہوں گی تو بڑی اچھی صحبت
رہے گی۔"

میں خاموش ہو گئی۔

" کل آپ کو بتاؤں گی "

" جب آپ کا جی چاہے "

گلاب کے کنج میں ایک بلبل بول رہی تھی۔ فضا میں گلاب
کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ وحید کے سگریٹ کی خوشبو
مل رہی تھی۔

"کتنی پیاری شام ہے۔"

"ہاں۔ سخت پیاری شام ہے۔"

"گلاب کے کنج میں بلبل بول رہی ہے۔"

"ہاں گلاب کے کنج میں بلبل بول رہی ہے۔"

"کیا آپ میری بات کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"بالکل نہیں میں آپ کی بات کی تائید کر رہا ہوں کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ یعنی شام بڑی خوبصورت ہے اور گلاب کے کنج میں بلبل بھی بول رہی ہے۔"

اسی دوران میں وہاں نوکرانی چائے لے آئی۔ وحید کے چہرے پر ایک بڑی دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا پھینک کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑے خوبصورت موقع پر چائے آئی ہے۔ گلاب کی خوشبو، بلبل کا نغمہ، ایک خوبصورت لڑکی کا ساتھ اور تازہ خوشبودار چائے۔" میں شرما گئی۔

"یہ آپ بار بار خوبصورت لڑکی کا کیوں ذکر کر رہے ہیں۔؟"

اس لیے کہ آپ واقعی خوبصورت ہیں اور خوبصورتی
قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے۔
ہیں نے کوئی جواب نہ دیا اور چائے بنانے لگی۔ پیالی ہیں تازہ
تازہ رسیلی اور سنہری اور خوشبودار چائے گرنے لگی۔
ہیں نے چائے بنا کر وحید کو دی۔ اس نے شکریہ کہکر پیالی تھام
لی اور اسے آہستہ آہستہ پینے لگا۔ ہیں نے سوچا کہ اگر ہیں
وحید کے ساتھ بنگال چلی جاؤں تو کیا میری زندگی ہیں ایک نیا بروست
انقلاب نہیں آجائے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے وحید سے محبت
ہوگئی تھی۔ اور ہیں نے اس کے ساتھ بنگال جانے کا فیصلہ کر
لیا تھا۔

۱۸

مجھے ڈھاکہ مشرقی پاکستان کے ایک کالج میں انگریزی کی پروفیسری مل گئی - میں ڈھاکہ روانہ ہو گئی - میں چھپ کر وحید سے ملی اور میں نے اسے بتا دیا کہ میں ،، . . . . ڈھاکے جا رہی ہوں - ،،

وحید نے کہا!

،، یہ کیا! آپ تو پہلے ہی روانہ ہو گئیں آپ نے تو میرے ساتھ چلنے کا پروگرام بنایا تھا۔

میں نے کہا۔

"بہر حال آپ بھی آ سکتے ہیں۔ ڈھاکہ جانے والے ہوائی جہاز کھلے ہیں۔"

"خیر ہمیں تو وہاں جانا ہی ہے۔ لیکن افسوس یہ کہ آپ کے ساتھ میں نہ جا سکوں گا۔ اگر آپ کچھ روز پہلے بتاتیں تو میں آپ کے ساتھ ہی ہوائی جہاز میں جگہ ریزرو کروا لیتا۔"

دوسرے روز میں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ڈھاکہ روانہ ہو گئی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وحید بھی میرے ساتھ ہوتا۔ کیوں کہ میں نے صرف وحید کے ساتھ اس شہر کی مسموم فضاؤں سے بہت دور کہیں جا کر زندگی کے کچھ روز بسر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین تھا کہ وحید وہاں آئے گا۔ ضرور ڈھاکہ پہنچ کر مجھے ایک بڑی ہی پرسکون جگہ پر اکیلی کوٹھی مل گئی۔ کرایہ بھی زیادہ نہ تھا۔ مجھے ہوسٹل میں ٹھہرنے کی بھی پیشکش کی گئی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے وحید کو اپنے کالج کا ایڈریس دے دیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے ایک کوٹھی مل گئی ہے۔

وحید کا فوراً ہی جواب آ گیا۔ اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ مجھے اچھی جگہ مل گئی تھی۔ لیکن

اس نے اپنے آنے کے بارے میں ایک بھی جملہ نہیں لکھا تھا۔ میں اداس ہو گئی۔

سارا بنگلہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ میں اس ویرانے میں پھر کس لیے آ گئی۔ جب وحید کو وہاں نہیں آنا تھا۔

کوئی ہفتہ گذرا ہو گا کہ ایک روز شام کو میں اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھی چائے کے بعد ایک رسالہ پڑھ رہی تھی کہ وحید چہرے پر مخصوص مسکراہٹ لیئے کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ میرا دل خوشی سے اچھل کر میرے حلق کے قریب آ گیا۔

میرا دل چاہا کہ بھاگ کر اس سے لپٹ جاؤں۔ لیکن شرم نے پاؤں جکڑ لیے میں وہیں کی وہیں رہ گئی۔ وحید نے مسکرا کر میرے پاس آکر کہا۔

"میں آ گیا ہوں جناب والا۔ اب بتائیے کیا حکم ہے۔"

میں نے منہ بنا کر کہا۔

"آپ نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"ہوائی جہاز سے آیا ہوں جناب عالی دیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو ہفتہ پہلے ہی یہاں

پہنچ جانا چاہیئے تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو انتظار دکھایا آئندہ ایسی گستاخی ہرگز ہرگز نہیں ہوگی۔

وحید نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پکڑ لیئے۔ پھر خود ہی شرما کر چھوڑ دیئے۔ گھبرا کر اٹھی اور رسالہ میرے ہاتھ سے گر پڑا۔

"آپ بیٹھئے میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سیدھا اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ چائے کا تو بہانہ تھا۔ وہ تو میں نوکرانی کو باہر ہی سے آواز دے سکتی تھی۔ مگر میں شرما گئی تھی۔ میں جلدی سے کمرے میں آکر آیئنے کے سامنے گئی۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ اور میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

میں نے رومال سے منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ تھوڑا سا پاؤڈر لگایا۔ نوکرانی کو چائے کے لیے کہا اور جلدی سے باہر آگئی۔ وحید باہر کرسی پر بیٹھا میرے رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ جب میں باتیں کرنے لگی تو وہ بولا۔

"بھئی آپ کو ساڑھی تو بڑی خوبصورت لگتی ہے۔
"یہ سچ کہتے ہیں آپ! مجھے تو ساڑھی باندھنی بھی نہیں آتی۔ ہم کسی اور طرح باندھتے ہیں۔ یہ تو میری ایک بنگالن سہیلی نے مجھے باندھ کر دی تھی"
وحید نے میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر ہنس کر بولا۔

"تم بالکل ٹیگور کی نظموں کی دیو داسی معلوم ہو رہی ہو"
"تعریف کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے!
" بھئی خوبصورت چیز کی تعریف نہ کرنا کفرانِ نعمت کے مترادف ہوتا ہے۔
اتنے میں چائے آگئی۔ میں نے چائے بنا کر وحید کو دی وحید نے چائے کی چسکیاں لے کر سگریٹ نکال کر سلگایا اور باغ کی بند بند سی فضا میں سگریٹ اور چائے کی پیاری خوشبو مخلوط ہو گئی۔ چائے کے دوران وحید مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

"یہاں دل لگ گیا ہے ناں؟
" مجھے بنگال سے محبت ہے۔ بنگال سارے کا سارا

اداس ہے۔ مگر میں بنگال میں آکر کبھی اداس نہیں ہوتی۔

" یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کہتے ہیں بنگال میں داخل ہونے کے لیے شمار راستے ہیں۔

مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ تم نے بنگال کے جادو کا سنا ہے ناں "

" ہاں ہاں "

" بس یہی بنگال کا جادو ہے کہ وہ یہاں آنے والے کا جی موہ لیتا ہے اور وہ شخص اسی ملک کا ہو کر رہ جاتا ہے "

کبھی کبھی دل اداس ہو جاتا تھا۔

" وہ کیوں "

" جانے کیوں "

وحید مسکرایا۔

میں جانتا ہوں تم کیوں اداس ہو جاتی تھیں۔

میں شرما گئی

بھلا بتایئے!

وحید نے بڑی بے باکی اور کمال خود اعتمادی سے بتایا

" اس لیے کہ میں یہاں نہیں آیا تھا۔ اچھا۔

اب میں جاتا ہوں ،،

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وحید کے منہ سے اس قسم کی بات سن کر میں حیران رہ گئی۔ مجھے گویا کسی نے میری ہی بات سنادی تھی۔ میرے سامنے میرا ہی آئینہ رکھ دیا تھا۔ میں شرم سے دہری ہو گئی۔ وحید جاتے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

،، آپ جا رہے ہیں ؟،،

،، ہاں بھئی۔ اور کیا کریں ؟،،

،، آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ؟

،، ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ ہم آوارہ گرد اور خانہ بدوش ہیں۔ ہمارا ٹھکانہ ہوٹل ہی ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا۔

،، آپ یہاں کیوں نہیں آجاتے ؟،،

،، دیکھو لو۔ اگر مناسب سمجھتی ہو تو آجاتا ہوں۔

،، میں تو اسے بالکل مناسب سمجھتی ہوں۔ ویسے اگر آپ ہوٹل میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتی ،،

،، کیسی باتیں کرتی ہو نیلوفر ! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ تمہارے ہوتے ہوئے میں ہوٹل میں پڑا رہوں
اور ذلیل کھاتے کھاتا رہوں۔

"جیسے آپ کی مرضی"

"میں کل ہی یہاں آجاؤں گا۔

اتنا کہکر وحید چلا گیا۔

وہ رات میں نے جاگ کر ہی گذار دی۔ خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ مجھے اس بات سے گہری خوشی حاصل ہو رہی تھی کہ کل سے وحید میرے پاس اسی کوٹھی میں ایک ہی چھت کے نیچے رہے گا۔ وہ دوسرے کمرے میں سو رہا ہوگا۔

میں اسے صبح اٹھکر دیکھا کروں گی۔ رات کو سونے سے پہلے اس کے ساتھ بیٹھ کر پیاری پیاری باتیں کیا کروں گی۔

میں وحید کی جرأت اور بے باکی پر حیرت کا اظہار کر رہی تھی کہ اس نے کیسی اعتماد اور دیدہ دلیری کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ میں محض اس کی وجہ سے اداس تھی۔ وگرنہ میرا دل بنگال میں لگ گیا تھا! اور یہ بات بھی درست تھی۔ میں صرف وحید کے لیے اداس اور افسردہ تھی۔ وگرنہ بنگال میں آکر میں کبھی اداس نہیں ہوئی۔

. . . .

دوسرے روز وحید اپنا اٹیچی کیس اور بستر لے کر آگیا۔ اس نے ایک کمرے میں اپنا بستر اور کتابیں نکال کر جمالیں۔ میں نے کہا۔

" اگر آپ کو میرے والا کمرہ پسند ہو تو بے شک وہ لے لیں "

" بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ میرے لیے ہر کمرہ ایک ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے صرف گھر کا سکون اور ایک خوبصورت لڑکی کا قرب چاہیئے۔

میں نے شرم سے سرخ ہو کر کہا۔

" خدا کے لیے آپ بار بار مجھے شرمندہ نہ کیا کریں۔"

کیوں کیا میں تم سے ادھار مانگتا ہوں جو تم شرمندہ ہوتی ہو۔ میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں تم واقعی خوبصورت ہو۔ اور تمہارا قرب میرے لیے باعث مسرت ہے اور میں فخر کرتا ہوں۔

" دنیا میں بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم دوسروں کے سامنے بیان نہیں کر سکتے۔

" تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ایسے حقائق جو خوشبودار

ہوں اور جس کوشش کر دوسرے کی صحت پر
اچھا اثر پڑے انہیں ضرور بیان کر دینا چاہیئے -
" چلیئے اب زیادہ باتیں نہ بنایئے اور چل کر غسل کریں
پانی تیار ہے "
" پانی تیار کا کیا مطلب ؟ "
" پانی گرم ہو گیا ہے "
" میں زندگی میں کبھی گرم پانی سے نہیں نہایا - میں سادھو
ہوں - ہر روز صبح ٹھنڈے پانی سے نہاتا ہوں "
" یہاں ہوا مرطوب ہے - گرم پانی ٹھیک رہے گا - ٹھنڈے
پانی سے کہیں نزلہ نہ ہو جائے "
" یہ باتیں دنیا دار لوگوں کو ہوا کرتی ہیں - ہم سادھو سنت
ہیں - ہمیں کبھی ایسے امراض لاحق نہیں ہوا کرتے "
" چلیئے ٹھنڈے پانی سے ہی غسل کر لیں "

۱۹

رات کو کھانے کے بعد ہم سیر کرنے باہر چلے گئے۔ فلم دیکھی۔ ایک اوپن ایئر کیفے میں کافی پی اور گھر واپس آ گئے۔ گھر آکر وحید اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں اپنے کمرے میں آگئی۔

"کنڈی لگالوں؟"

میں نے پوچھا۔

وحید نے کہا۔

"اپنے دل سے پوچھ لو۔"

میں شرما گئی - میں نے کوئی جواب نہ دیا - میرا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا - لیکن میں نے کنڈی لگا دی -

اور کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گئی اور کتاب پڑھنے لگی - لیکن میرا دل اسی طرح دھڑک رہا تھا - مجھے نیند نہیں آ رہی تھی سر چکر کھا رہا تھا - حلق بار بار خشک ہو رہا تھا -

آخر میں نے بتی گل کر دی - اور آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی تیاری کرنے لگی - میں نے دیکھا کہ وحید کے کمرے کے روشندان میں سے روشنی چھن چھن کر میرے کمرے میں آ رہی تھی - میرے کمرے میں پہلے تو اندھیرا چھا گیا - پھر کمرے کی ہر چیز آہستہ آہستہ اندھیرے میں سے جھانکنے لگی -

میں نے آواز بلند کر کے کہا -

"آپ کیا کر رہے ہیں ادھر؟"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"آپ کی روشنی مجھے سونے نہیں دیتی"

"تم اپنی آنکھیں بند کر لو"

دوسرے کمرے سے وحید کی آواز آئی -

"میں آنکھیں بند نہیں کر سکتی"

،، پھر ہماری تمہاری روز لڑائی ہوا کرے گی۔

میں روشنی نہیں بجھاؤں گا ،،

،، آپ رات کو کیا کرتے ہیں ،،

،، جو لوگ دن کو نہیں کر سکتے ،،

،، بس میں سوئچ بند کرنے لگی ہوں ،،

،، خدا کے لیئے ایسا نہ کرنا ،،

،، میں بند کر رہی ہوں ،،

،، اچھا بابا میں بتی گل کر دیتا ہوں ،،

اور اس کے ساتھ ہی وحید کے کمرے کی بتی گل ہو گئی۔

میرے کمرے میں بھی اندھیرا چھا گیا۔ روشندان پر بھی اندھیرا چھا گیا
تھوڑی دیر بعد میں نے روشندان پر نگاہ ڈالی۔ تو دیکھا کہ وہاں
ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ روشنی کہاں سے آ
رہی ہے ؟

میں بستر پر سے آہستہ سے اٹھی۔ میں نے کرسی دروازے
کے آگے کی۔

کرسی پر چڑھ کر روشندان میں سے دوسری طرف جھانک
کر دیکھا۔ دوسری طرف وحید نے موم بتی جلا رکھی تھی۔ اور اس کی

ناکافی روشنی میں پلنگ کے بازو سے ٹیک لگائے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔

مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔ بلکہ بڑا پیار آیا۔ میں نے واپس اپنے بستر پر جاکر لیٹے ہوئے اسے آواز دی۔

"یہ آپ نے کیا جلا رکھا ہے"؟

دوسرے کمرے سے وحید کی آواز آئی

"موم بتی! کیوں کوئی اعتراض ہے اس پہ بھی؟

"جی ہاں بہت بڑا اعتراض ہے اور وہ یہ کہ موم بتی سے آپ کی آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ آپ برائے مہربانی بتی جلالیں"

"شکریہ! لیکن کیا تمہیں نیند آجائے گی۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔

اس کے بعد وحید نے بتی جلا دی۔ میرے کمرے میں پھر ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ لیکن اب میں مطمئن تھی اور مجھے نیند آگئی اور میں سو گئی۔

وحید اپنے ساتھ ایک ریڈیو بھی لایا تھا۔ صبح صبح میری آنکھ کھلی تو مجھے اس کے کمرے سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے بہت

سے ہندو سادھو ہوا پنڈت برہمن کسی مندر کے باہر بیٹھے بھجن گا رہے ہوں۔ کافی دیر تک یہ بھجن ہوتے رہے۔ پھر ریڈیو سے قرآن حکیم کی تلاوت کی صدا بلند ہوئی۔ کوئی سات بجے وجید کمرے سے باہر نکلا میں اسے دیکھکر حیران رہ گئی۔ اس نے سفید کرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر تلک لگا تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی اندر سے اگر بتیوں کی خوشبو کا ایک گہرا اور بوجھل جھونکا آیا اور میرا کمرہ بھی ان کی خوشبو سے لبریز ہو گیا۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ ماتھے پر آپ نے کیا لگا رکھا ہے؟"

"یہ تلک ہے"

"یہ تو ہندو لگاتے ہیں۔"

"ہاں میں ہندو ہوں۔ پچھلے جنم میں میرا نام گوتم داس تھا اس جنم میں میں مسلمان ہوں"

"اور اگلے جنم میں آپ کیا ہوں گے"

"اگلے جنم میں میں انسان نہیں ہوں گا۔ بلکہ الوچے یا ناشپاتی کا پیڑ بنوں گا۔"

ابھی میں ان درختوں میں سے کسی ایک کا فیصلہ نہیں کر سکا۔"

"آپ بڑی عجیب باتیں کرتے ہیں"

"چائے تیار ہے کیا!

"چائے تو تیار ہے۔ لیکن یہ بتایئے کہ اندر یہ آپ نے پنڈت بھجن گانے کے لیئے بیٹھا رکھے تھے؟

"چائے تیار ہے کیا؟

وحید کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس موضوع پر مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھی۔ اور جلدی سے ناشتے کا بندوبست کیا۔ ناشتے کے بعد وحید ایک کتاب اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اور میں اپنے کالج روانہ ہو گئی۔

وحید نے ڈھاکے میں کوئی نوکری نہیں کی تھی۔ وہ انگریزی اور فارسی کا ایم اے تھا۔ مگر نوکری نہیں کرتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ امیر آدمی تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ اور اس کے باپ کی شہر لاہور اور کراچی میں کافی جائیداد تھی۔ اور ساری کی ساری جائداد وحید کے نام لکھی گئی تھی۔ کیوں کہ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے کرائے کی کافی رقم آجاتی تھی۔

رات کو وحید دیر سے واپس آیا۔ اس نے جوہی کے پھولوں کا بڑا سا گلدستہ اٹھا رکھا تھا۔

"یہ آپ کہاں سے خرید کر لائے ہیں!"

وحید نے جھک کر کہا۔

"میں پھول خریدا نہیں کرتا نیلو! یہ میں نے چوکیدار کی آنکھ بچا کر ایک سرکاری باغ میں سے چرائے ہیں۔ لو یہ آدھے تم لے لو اور اپنے گلدان میں لگا لو۔"

اور پھر اس نے خود ہی جوہی کی آدھی کلیاں اپنے ہاتھوں سے میرے گلدان میں لگا دیں کمرہ جوہی کی دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی خوشبو سے معطر ہو گیا۔ باقی کی کلیاں اس نے اپنے کمرے میں جا کر گلدان میں لگا لیں اور واپس آ کر بولا۔ کافی مل جائے گی؟

"کیوں نہیں؟"

"تمہارا جواب نہیں ہے نیلو"

"آپ نے اتنی دیر کہاں کر دی۔ کھانا کہاں سے کھایا دوپہر کا بھی کھانا آپ نے یہاں نہیں کھایا۔

"فکر نہ کرو۔ میرے کھانے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ تم ذرا کافی بنا ڈالو"

۲۰

کافی وحید نے بڑی خاموشی سے پی۔

اس نے بہت ہی کم مجھ سے بات کی اور مجھے سلام کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے اپنی طرف سے چٹخنی لگا لی اور بستر پر لیٹ گئی۔ بتی گل کر دی۔ کتنی ہی دیر مجھے نیند نہ آئی میں بستر پہ پہلو بدلتی رہی۔ کبھی وحید کے کمرے کے روشندان کو دیکھتی ہلکی ہلکی سفید روشنی روشندان کے شیشے پہ پھیلی ہوئی تھی۔ میں تصور ہی تصور میں دیکھ رہی تھی۔ کہ وحید نے پلنگ سے ٹیک لگا رکھی ہے۔ جوہی کی نازک نازک کلیاں گلدان میں میز پہ اس کے پاس رکھی ہیں۔ اور سگریٹ اس کی نازک

انگلیوں میں سلگ رہا ہے اور وہ کتاب پڑھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑے انہماک سے کتاب کے حروف کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور چہرے پر ایک بڑی ہی ذہین اور دل آویز چمک پھیلی ہوئی ہے۔

میرا دل چاہا کہ چٹخنی کھول کر دوسرے کمرے میں چلی جاؤں۔ اور وحید کے قدموں سے لپٹ کر کہوں۔

وحید خدا کے لیے اب مجھے اپنے قدموں سے الگ نہ کرنا میں تم سے جدا ہو کر اب زندہ نہ رہ سکوں گی۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہیں پایا ہے۔ میں بڑی دور سے تمہاری تلاش میں تم تک پہنچی ہوں۔ دیکھو! میرے پاؤں پر چھالے پڑ گئے ہیں۔ میرا سر گرد آلود ہے۔

میرے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔......

لیکن میں سو گئی۔

صبح ریڈیو کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔ وحید کے نیلا کمرے کے کواڑوں میں سے اگر بتی کی گہری خوشبو میرے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں اچانک یہ خیال آیا کہ میں اٹھ کر دیکھوں کہ وحید دوسرے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ میں آہستہ سے بستر پر سے اٹھی۔ میں نے کرسی اٹھا کر دروازے کے ساتھ لگائی اور پر چڑھ

کر روشندان میں سے دوسرے کمرے میں جھانکا۔

میں نے حیرانی سے دیکھا کہ وحید کمرے کے وسط میں جانماز پر قبلہ رو ہو کر دوزانو بیٹھا تھا۔ اگر بتیاں چاروں طرف سلگ رہی تھیں۔ جوہی کے پھول بالکل ترو تازہ معلوم ہو رہے تھے ریڈیو پر بھجن ہو رہے تھے۔ وحید کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ زانوؤں پر رکھے ہوئے تھے۔

چہرے پر ایک حیرت ناک قسم کی پر جلال اور خوبصورت روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔

دل چاہا کہ اندر جا کر وحید کے پاس ہی دوزانو ہو کر بیٹھ جاؤں۔

اور اپنی آنکھیں بند کر کے سر جھکا لوں اور اس کی عبادت میں شریک ہو جاؤں۔ لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وحید کی عبادت کے موڈ میں خلل کا باعث بنوں۔ پھر اس نے ریڈیو پر سوئی بدل اور وہاں سے قرآن حکیم کی تلاوت شروع ہو گئی۔ وحید بدستور پہلے کی طرح جانماز پر بیٹھا رہا۔ اور سر جھکا کر قرآن کریم کی تلاوت سننے لگا۔

میں کرسی پر سے اتر گئی۔

. . . .

تھوڑی دیر بعد وحید کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور وہ بڑا ہی دل کش، ہلکا، چہکتا، چمکتا ہوا، مسکراتا ہوا چہرہ لیے باہر آ گیا اور بولا۔

"کیوں جناب عالی! چائے تیار ہے؟"

"ہاں جناب عالی! بالکل تیار ہے"

"جناب عالی کا بہت بہت شکریہ!"

"شکریہ جناب عالی"

وحید زور سے ہنس پڑا۔ ناشتے کی میز پر اس نے مجھ سے بڑی ہی دلچسپ باتیں کیں۔

وہ بات بات پر مجھے ہنساتا رہا۔

اسی طرح وحید کے ساتھ ایک مہینہ گذر گیا۔ وحید کے ساتھ گذرے ہوئے لمحات روشنیوں اور رنگوں سے معمور تھے۔ ان لمحات نے میری ساری زندگی بدل کر رکھ دی میرے سارے زخم ایک ایک کر کے اچھے ہو گئے۔ میرے ماضی کی ساری گرد دھل گئی۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں کبھی عذرا وہ بھی تھی اور روز و شب خدا سے موت کی دعائیں

مانگا کرتی تھی ۔ لیکن اس اثنا میں وحید نے ایک بار بھی مجھ سے محبت کا ذکر نہ کیا تھا۔ میں اس کی محبت میں برابر آگے بڑھ رہی تھی لیکن یہ میں نہ جانتی تھی کہ وہ بھی اندر ہی اندر محبت کے اس سفر میں میرا ہم سفر ہے یا وہیں کا وہیں کھڑا ہے ۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا ۔

ہفتہ کی رات تھی ۔ شام کو ہم دونوں سینما دیکھنے گئے ۔ سینما سے واپس آگر ہم نے کمرے میں بیٹھ کر کافی پی ۔ اس کے بعد وحید نے ہارمونیم کی پیٹی کھول لی ۔

"بولو تمہیں کیا سناؤں آج ؟"

"غالب کی کوئی غزل سنائیے آج !"

"آج غالب کیوں یاد آنے لگا ؟"

"آج میری ذہنی کیفیت خود میری سمجھ میں نہیں آرہی ۔ اس لئے کسی ایسے شاعر کی غزل سننا چاہتی ہوں جو سمجھ میں نہ آئے ۔"

وحید ہنس پڑا ۔

"یہ تمہیں کس نے کہا کہ غالب سمجھ میں نہیں آتا ؟"

"میری سمجھ میں تو بہت ہی کم آیا ہے !"

"تو اس میں غالب کا کیا قصور ہے ؟"

اس دوران میں وحید ہارمونیم کو سُر بھی کرتا رہا ۔ جب ہارمونیم سُر ہو گیا تو اس نے سگریٹ کا ایک کش لگا کر اسے بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے غالب

کی یہ غزل شروع کر دی

؎ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جب وہ اس شعر پر پہنچا

؎ ڈھونڈے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

تو اس نے آنکھیں کھول کر ذرا سا مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے کیا کہنا چاہتا تھا۔ غزل ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر ہارمونیم پر یونہی انگلیاں چلانے کے بعد وحید نے باجہ دوسری طرف رکھ دیا۔ اور سگریٹ سلگا کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

"آپ اس شعر پر میری طرف دیکھ کر مسکرائے کیوں تھے؟"

"کیا کسی شعر پر کسی کی طرف دیکھ کر مسکرانا جرم ہے؟"

"جرم تو نہیں ہے، لیکن ہر بات کا، ہر اشارے کا کچھ نہ کچھ مطلب ہوا کرتا ہے۔ میں نہیں سمجھی کہ آپ کا مطلب کیا تھا؟"

"تم سب سمجھتی ہو۔"

میں خاموش ہو گئی۔ وحید چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

"میں کیا سمجھتی ہوں کچھ مجھے بھی بتائیے! اور اگر آپ یہ نہیں بتا سکتے تو پھر

مجھے یہ بتائیے کہ آپ کیا سمجھتے ہیں ؟"

وحید نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ اس نے مسکرا کر میرا کندھا تھپتھپایا اور اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ میں بھی اٹھ کر اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ مگر آج رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی تھی۔ ادھر وحید کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اور روشندان میں سے چھن چھن کر ہلکی ہلکی روشنی میرے کمرے میں آ کر چیزوں کو ہلکے ہلکے اُجال رہی تھی۔ ایک دو بار مجھے وحید کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

آج میں نے قصداً دروازے کی چٹخنی نہیں لگائی تھی۔ مجھے کچھ یوں لگتا تھا جیسے میں آج کی رات وحید کے قدموں سے جا کر ضرور لیٹ جاؤں گی اور اسے کہوں گی کہ اب مجھے اپنے آپ سے جُدا نہ کرے۔

کافی دیر گذر گئی۔ میں ضبط نہ کر سکی۔ میرا دل بیتاب ہو گیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر بستر پر سے اٹھنے ہی والی تھی کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی دروازے کے پاس آ کر رک گیا ہے۔ تو کیا وحید ادھر آ رہا ہے ؟ نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ اٹھ کر میرے پاس آئے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اچانک دروازہ کھلا اور وحید کی آواز آئی۔

"نیلوفر! سو گئی ہو کیا ؟"

میرے ہونٹوں پر جیسے کسی نے تالہ لگا دیا۔ میں بول ہی نہ سکی۔ میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ وحید میرے پاس آگیا۔ اور میرے بستر پر بیٹھ کر میرے شانے پر اپنا گرم اور پُرسکون ہاتھ رکھ کر بولا۔

"نیلوفر! نیلوفر!"

میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے میں سو رہی ہوں۔ وحید کے دو تین بار جگانے سے میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور جھوٹ موٹ سنبھل کر بیٹھ گئی اور حیران ہو کر پوچھا۔

"خیریت ہے کیا؟"

وحید نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ پھر دونوں ہاتھ چھوڑ کر بولا۔

"نیند نہیں آ رہی نیلوفر!"

"کیا سر درد کر رہا ہے؟ دبا دوں؟"

"میرا سر کبھی درد نہیں کیا کرتا!"

"پھر نیند کیوں نہیں آ رہی؟"

"اس کی ایک وجہ ہے؟"

"میں پوچھ سکتی ہوں وجہ؟"

وحید نے سلیپنگ سوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ

سلگایا۔ سگریٹ کا سرا اندھیرے میں چمک اٹھا۔ اگرچہ کمرے کی بتی نہیں جل رہی تھی لیکن ساتھ والے کمرے سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اور ہم ایک دوسرے کے چہرے اچھی طرح سے دیکھ سکتے تھے۔ وحید نے اچانک میری طرف دیکھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بولا۔

"اس دنیا میں محبت سب جذبوں سے بالکل الگ اور دلچسپ جذبہ ہے نیلو! یہ بہت پاک بھی ہے اور شرمیلا بھی۔ میرے اس جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ تمہیں نیند تو نہیں آ رہی ناں؟"

میری نیند تو شام ہی سے اڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کی باتیں اچھی طرح سن رہی ہوں۔ آپ کہتے جایئے!"

"بات یہ ہے کہ مجھے تم سے شدید محبت ہو گئی ہے۔"

میرا دل خوشی سے اچھل کر باہر آنے لگا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ وحید نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کے ہونٹ اس کے ہاتھوں کی طرح گرم تھے۔

"شرماؤ نہیں۔ یہ بڑی فطری بات ہے۔ محبت تو مجھے اسی روز ہو گئی تھی جب تم نے میرے ساتھ گلاب کی جھاڑیوں کے پاس چائے پی تھی اور میں نے تمہیں ٹیگور کی نظمیں سنائی تھیں۔ لیکن مجھے اس کا پورا علم نہیں تھا اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں تو تمہاری محبت میں پوری طرح جکڑا جا چکا ہوں۔ اور کوشش بھی کروں تو تمہیں اپنی زندگی سے الگ نہیں کر سکتا۔ لیکن

میں پہلے تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں میری محبت کا اظہار ناگوار تو نہیں گذرا؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ تم میری طرف سے اظہارِ محبت کے لئے بالکل ہی تیار نہ ہو اور حیران ہو گئی ہو۔ ویسے تمہارا چہرہ بتلا رہا ہے کہ تمہیں حیرت نہیں ہوئی۔ بولو نیلوفر! کیا تم میری محبت سے ناراض تو نہیں ہو؟"

میں اسے کیا جواب دیتی! اس نے تو میرے دل کی بات اپنی زبان سے بیان کر دی تھی۔ میرا خوشی سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میرا انگ انگ مسرت کے بھرپور احساس سے رقص کر رہا تھا۔ ساری کائنات رقص کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف سورج اور چاند ستارے گردش کرنے لگے تھے۔ میں نے سر جھکا لیا۔

وحید نے جب بار بار مجھ سے پوچھا تو میں نے صرف آہستہ سے اتنا ہی کہا۔

"آپ اپنے دل سے پوچھیں۔"

"اپنے دل سے تو میں نے پوچھ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا بلا جھجک نیلوفر سے اپنی محبت کا اظہار کر دو۔ میں کل سے پریشان ہوں اور یہ محبت ایک بوجھ بن کر میرے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمہاری امانت تمہارے حوالے کر دی۔ لیکن میں تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں کہ کیا تمہیں بھی کچھ کچھ ــــ تھوڑی تھوڑی مجھ سے محبت ہے یا نہیں؟ میرا مطلب ہے اتنی محبت

ہے کہ تم میری محبت کو گوارا کر لو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جب وحید نے بے حد اصرار کیا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"میں بھی اسی روز سے تمہاری محبت میں گرفتار ہوں وحید! جس روز میں نے تمہارا یونیورسٹی ہال میں گانا سنا تھا۔ لیکن دل میں اتنی جرأت نہیں پاتی تھی کہ تم سے اپنی محبت کا اظہار کر دوں۔ اس جوالا مکھی کو اپنے سینے کے اندر اندر ہی چھپائے بیٹھی تھی۔ اور اگر تم آج محبت کا اظہار نہ کرتے تو شاید میری زبان کبھی بھی نہ کھلتی اور میں اس انمول رتن کو اپنے سینے میں بند ساتھ ہی لے جاتی۔"

وحید نے مسکرا کر کہا۔

عورت کتنی بھی پڑھ لکھ کیوں نہ جائے وہ محبت کے معاملے میں خالص عورت ہی ہوتی ہے۔ لیکن میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں نے کل یہ محسوس کیا کہ میں اب بھی تمہاری جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کل کی رات تو میں نے برداشت کر لی لیکن آج کی رات اس راز کو سینے میں لئے بسر کرنا بڑا دشوار تھا۔ چنانچہ میں اپنے دل کا نذرانہ لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ اب یہ حضور کی مرضی پر منحصر ہے کہ چاہیں اسے ٹھکرائیں یا اپنی پناہ میں لے لیں۔"

میں نے جلدی سے وحید کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیئے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کی محبت کی امانت کو لے سکوں۔"

"کیوں؟"

"میں بڑی بدنصیب ہوں۔ ڈرتی ہوں کہیں میری وجہ سے آپ پر بھی کوئی آفت نہ آجائے!"

وحید ہنس پڑا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو تم! میں تمہیں دو باتیں بتا دوں۔ میں ماضی پرست نہیں ہوں۔ میں ہمیشہ حال پر یقین رکھتا ہوں۔ اور اسی کے لیے جدوجہد کرتا ہوں۔ میں جس لمحے میں زندہ ہوں صرف اسی کے لیے زندہ رہتا ہوں۔ چنانچہ تمہارا ماضی کیا تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں تمہارے ماضی سے سروکار رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ ماضی میں تم میری واقف ہی نہ تھیں۔ مجھے تو صرف اس وقت سے دلچسپی ہے جب سے تم میری زندگی میں آگئی ہو اور میں صرف اسی وقت سے تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے خدا پر بڑا بھروسہ ہے۔ میں نے اپنی تقدیر اس کے حوالے کر رکھی ہے اور میرا کام صرف عمل کرنا ہے۔ اور میں کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے اچھا عمل ہی ہو۔ چنانچہ میں نے اپنی محبت کا اعلان کر دیا ہے۔ اب میں جلد از جلد تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کیا تم مجھ سے

شادی کرنے پر راضی ہو؟ کیونکہ محبت اپنی جگہ پر ہے اور شادی اپنی جگہ پر۔ ہو سکتا ہے تم مجھ سے محبت کرتی ہو مگر شادی نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس لئے تمہاری منظوری بڑی ضروری ہے۔ میری کچھ ایسی ویسی عادتیں نہیں ہیں جن کا تمہیں تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہو۔ بس صبح کو پھول۔ اگربتی۔ ریڈیو اور چائے اور باقی اللہ اللہ خیر صلّیٰ۔ سارا دن رات بڑی سادگی سے بسر کرتا ہوں۔ اب بتاؤ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

شادی کا لفظ سنتے ہی میں خوشی سے اور حیرانی سے نہال ہو گئی تھی۔ ایک مدت کے بعد میری زندگی کو معانی مل رہے تھے۔ اور میری بھٹکی ہوئی روح کو منزل کا سراغ مل رہا تھا۔ یہ تو میری عین خوش قسمتی تھی کہ جلد سے میری شادی ہو جائے۔ لیکن میں اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر یا اس کے کسی بھی جذبے سے فائدہ اٹھا کر اس سے جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ پوری تسلی کر لے۔

"آپ اپنی بہن اور والد سے مشورہ کر لیں۔ پھر شادی کی بات کریں۔"

"کیوں؟ شادی میں نے کرنی ہے انہوں نے تو نہیں کرنی ہے۔"

"پھر بھی میرا مطلب ہے۔"

"تم مطلب چھوڑو میری جان! میں نے فیصلہ کر لیا۔ تم نے منظوری دے دی۔ اور بس۔ ایک ہفتے کے اندر اندر بیاہ ہو جائے گا۔ میں کل ہی ڈھاکہ

سے واپس لاہور جا رہا ہوں۔ جاتے ہی والد اور بہن سے بات کروں گا۔ انہیں یقیناً بہت خوشی ہوگی اور ایک ہفتے کے بعد یعنی ٹھیک آج ہی کے روز ہماری اور تمہاری شادی ہو جائے گی۔"

"آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔ شادی بچوں کا کھیل نہیں ہوتی۔ ساری زندگی کے ساتھ نبھانے کی بات ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ کو پچھتانا پڑے۔"

وحید نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"محبت میں پچھتانے والے محبت کے لائق نہیں ہوتے۔ محبت میں محبت کرنے والا کبھی نہیں پچھتایا کرتا۔ پچھتاوا ایک عذاب ہے اور محبت کرنے والے پر تو خدا کی رحمت نازل ہوا کرتی ہے۔"

اس کے بعد اس نے مجھے آگے بڑھ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑی نرمی، بڑی ہی ملائمت اور محبت سے میرا منہ چوم لیا۔ اس کے ہونٹوں سے اگربتیوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اور اس کی سانس بھی اسی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ میں مدہوش سی ہو کر رہ گئی۔ کتنی ہی دیر وحید نے مجھے اپنے ساتھ لپٹائے رکھا۔ اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کو ثبت کیے رکھا۔ ہماری سانسیں ایک دوسرے کے سانس کے ساتھ چل رہے تھے۔ بے تاب دھڑکتے ہوئے دل، ایک ساتھ، ایک ہی لے پر رقص کر رہے تھے۔ وحید کا چہرہ

گرم ہو کر جیسے سلگ رہا تھا۔ اور سانس گرم گرم خوشبو دے رہا تھا۔ میرے سارے جسم میں ایک قسم کی روشنی سی داخل ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن میرے ذہن میں انتہائی خوبصورت اور پاکیزہ مناظر گھوم رہے تھے۔

وحید نے آہستہ سے اپنا چہرہ پرے ہٹایا۔ اور اندھیرے میں میری طرف چمکتی آنکھوں سے بولا۔

"تم نے بھی سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے ناں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ بعد میں تمہیں افسوس ہو کہ تم نے ایک وقتی جذبے کے تاثر سے مغلوب ہو کر خواہ مخواہ مجھ سے شادی کر لی۔ اگر ایسی بات ہے تو اب بھی سوچ لو۔ ابھی بہت وقت ہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر وحید کے سینے سے لگا دیا۔ اور لرزتی آواز میں کہا۔

"آبِ حیات کے چشمے پر آیا ہوا مسافر یہ سوچ کر کبھی نہیں پچھتایا کرتا کہ وہ کیوں وہاں آ گیا۔ تمہارے ساتھ بسر ہونے والی زندگی میری انتہائی حسین ترین زندگی ہو گی۔ میں اپنے آپ کو اس وقت دنیا کی خوش قسمت ترین عورت خیال کر رہی ہوں۔"

وحید نے میرا بے اختیار منہ چوم لیا۔

"تم بڑی دل آویز ہو نیلو! بڑی ہی دل آویز ہو —— اچھا اب سو جاؤ —— !"

اس کے بعد وحید چلا گیا۔ مجھے ساری رات نیند نہ آسکی۔ غم سے نہیں بلکہ فرطِ مسرت سے!

۲۱

دوسرے روز وحید لاہور چلا گیا۔ اپنی شادی کی تیاریوں کے لیئے۔ میں اسے رخصت کرنے ہوائی اڈے تک گئی۔ اس نے سلیٹی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سرخ ٹائی لگائی ہوئی تھی وہ مسکرا رہا تھا اور بڑا خوش خوش تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اور آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہیں لاہور بلا رہا ہوں۔ میں تار دوں گا۔ تم تار ملتے ہی ہوائی جہاز پر سوار ہو جانا۔ ہم شادی لاہور میں ہی کریں گے اچھا خدا حافظ!"

رہی" خدا حافظ!"

وحید جہاز میں سوار ہو گیا۔ جہاز نے حرکت شروع کر دی۔ وحید کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور ہاتھ ہلا رہا تھا۔

خدا حافظ! میرے پیارے! میں بھی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ جانے کیوں؟ یہ بدشگونی ہے۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا اور واپس کالج آگئی۔

....

دو روز بعد وحید کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ والدہ اور بہن نے شادی کی خبر کو بڑی خوشی کے ساتھ سنا اور وہ تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہیں۔ اب تم میرے تار کا انتظار کرو۔ جس وقت تمہیں میرا تار ملے فوراً جہاز میں سوار ہو کر لاہور کی طرف پرواز کر جاؤ۔

اس خط نے میرے دل سے رہے سہے وہمات کو بھی دور کر دیا۔ میں خوشی سے کمرے میں رقص کرنے لگی۔ میں نے ریڈیو پر رکھی ہوئی وحید کی تصویر کو بے اختیار چوم لیا۔ سارا دن میں کالج میں بڑی خوش رہی۔ اور ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ شام کو میں اپنی ایک پروفیسر دوست کے ساتھ فلم دیکھنے گئی۔ واپس آکر میں نے وحید کو محبت بھرا ایک طویل خط لکھا۔ لفافے میں بند کر کے اسے ٹکٹ لگائے۔ دودھ پیا اور بتی بجھا کر سو گئی اور خواب میں وحید کے ساتھ

دلہن بنی ملک ملک کی سیریں کرتی رہی۔

صبح بڑے خوبصورت موڈ میں اٹھی۔ غسل سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا خط کو پوسٹ کروایا اور کالج آگئی۔ وہ دن بھی بڑی مسرت سے گذر گیا۔ تیسرے روز مجھے وحید کے تار کا انتظار شروع ہو گیا۔ وہ دن گذر گیا۔ چوتھا روز آگیا۔ وہ بھی گذر گیا پانچواں روز آگیا۔ وہ بھی گذر گیا۔ میں کچھ پریشان ہو گئی۔ خدا خیر کرے۔ وحید نے تو کہا تھا کہ وہ دو دنوں کے اندر اندر تار دے دے گا۔ اب میری راتوں کی نیندیں اڑ گئیں دن پریشانی کے عالم میں گذرنے لگا۔ ایک ہفتہ گذر گیا مگر نہ تو وحید کی طرف سے کوئی خط ہی آیا اور نہ تار ہی آیا۔ مجھے پریشانی اور فکر سے بخار ہو گیا۔

اچانک آٹھویں روز وحید کی بہن کا ایک خط مجھے موصول ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے چھ سات سطریں ہی پڑھی تھیں کہ اچانک مجھے ایک شدید چکر آیا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

جب ہوش آیا تو میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی اور میں پھر بے ہوش ہو گئی۔ میں ایک مہینہ ڈھاکہ کے ہسپتال میں پڑی رہی۔ وہاں سے نکل کر چٹا گانگ چلی گئی۔ وہاں ڈاکٹروں کے مشورے سے مجھے سینی ٹوریم میں داخل کر دیا گیا۔ چھ ماہ سینی ٹوریم میں رہی۔ اس دوران میں وحید کی بہن کا خط میرے ساتھ رہا۔ خط مختصر تھا اور دس پندرہ سطروں پر مشتمل تھا۔ وہ خط آج بھی میرے پرانے صندوق میں بند

پڑا ہے۔ اس خط میں صرف اسی قدر لکھا تھا کہ وحید اپنی شادی کا سامان لے کر گھر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اس کی کار کی ایک ٹرک سے ٹکر ہوگئی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا۔

اس بات کو آج دس سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ میں وحید کی قبر پر ہر جمعرات کو پھول چڑھاتی ہوں۔ دیا جلاتی ہوں۔ اور اس کی پسندیدہ اگر بتیاں سلگاتی ہوں۔ کاش میں وہاں بیٹھ کر ایک بھجن بھی گا سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ اس سے وحید کی روح بڑی خوش ہوگی۔ میں جوہی کی کلیاں خاص طور پر منگوا رکھتی ہوں۔ اور اپنے ہاتھوں سے جا کر اس کی قبر پر بکھیرتی ہوں۔ اور آنسو بہا کر واپس آ جاتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ اب بھی سلیٹی رنگ کے سوٹ میں ملبوس سرخ ٹائی لگائے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"گھبراؤ نہیں شیلو! میں بہت جلد تمہیں بلا لوں گا۔"

۳- دل سٹریٹ،
فلیمنگ روڈ
اے حمید
لاہور ۲۳؍۶

سول ایجنٹ برائے ملتان

خالد پبلیکیشنز نواں شہر ملتان (مطبوعہ تاجی پریس لاہور)